کہاں گئے یہ لوگ!
نور شاہ

کہاں گئے یہ لوگ!

نور شاہ

مسکن: 14 للہ دید کالونی۔ غوری پورہ لنک روڈ، راول پورہ سرینگر 190005
(کشمیر)   فون: 9906771363

- نام کتاب : کہاں گئے وہ لوگ
- نوعیت : یادیں
- مصنف : نورشاہ
- بار اول : ۲۰۰۹ء
- قیمت : دوسو روپے
- کمپیوٹر کتابت : ساغر کمپیوٹرس سرینگر کشمیر
- سرورق :
- مطبع :

ملنے کا پتہ

- للہ دید کالونی۔غوری پورہ لنک روڈ، راول پورہ سرینگر 190005 (کشمیر)
- فون: 9906771363
- کتاب گھر، امیرا کدل سرینگر
- میزان پبلشرز۔بٹہ مالو سرینگر کشمیر
- امیکس بکس۔این آئی ٹی روڈ، حضرت بل سرینگر کشمیر
- سکندر نیوز ایجنسی، نزد گوردوارہ، لعل چوک سرینگر 190001 (کشمیر)
- ہمالیہ بک ڈیپو، شہیدی چوک، جموں

انتساب

جاوید آذر

اور

عمر مجید

...... کے نام

مصنف کی دوسری کتابیں

❁ بے گھاٹ کی ناؤ	افسانے
❁ نیلی جھیل کالے سائے	ناول
❁ ویرانے کے پھول	افسانے
❁ من کا آنگن اُداس اُداس	افسانے
❁ پائل کی زنجیر	ناول
❁ آؤ سو جائیں	ناولٹ (ناولٹ نمبر شاعر ممبئی)
❁ انتخاب اردو ادب	(ریاست جموں و کشمیر۔ 1947 سے 1971 تک ایک جائزہ)
❁ گیلے پتھروں کی مہک	افسانے
❁ آدھی رات کا سورج	ناولٹ (ہفتہ وار احتساب سرینگر میں قسط وار شائع ہوا)
❁ لمحے اور زنجیریں	ناولٹ (ہفتہ وار صدرنگ سحر سرینگر میں قسط وار شائع ہوا)
❁ بے ثمر سچ	افسانے
❁ ایک لمبی عمر کی تنہائی	افسانے
❁ بند کمرے کی کھڑکی	ڈائری کے اوراق پر مشتمل رفتہ رفتہ یادیں

زیر اشاعت

❁ برف اور سناٹے	ناول
❁ بارش کا پہلا قطرہ	ڈرامے

ترتیب

اپنی بات

''بند کمرے کی کھڑکی'' کے بعد ''کہاں گئے یہ لوگ'' پیشِ خدمت ہے۔

''بند کمرے کی کھڑکی'' میری ڈائری کے اوراق پر مشتمل ہے اور یہ اوراق قریب قریب تین برس تک ریاست کے معروف اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' میں شائع ہوتے رہے۔ ''کہاں گئے یہ لوگ'' کے عنوان سے لکھا میرا کالم بھی کشمیر عظمیٰ میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اب تک اس عنوان کے تحت ستر کالم قلم بند کر چکا ہوں۔ ان کالموں میں، میں نے ریاست اور ریاست سے باہر کے چند اہم، معتبر اور معروف قلم کاروں کی ادبی اور علمی عظمتوں کو اپنے انداز سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش بھی میرے پڑھنے والوں کو پسند آئے گی۔ میرے اس تصویر خانے میں آپ کو بہت سی نئی پرانی اور جانی پہچانی تصویریں نظر آئیں گی ان تصویروں میں رنگ بھرنے اور انہیں سجانے سنوارنے میں، میں نے جن قلکاروں کی تخلیقات اور تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، میں اُن کا شکر گذار ہوں۔

کشمیر عظمیٰ کے مدیر اعلیٰ فیاض احمد کلو صحافت اور ادب کے آپسی رشتے کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں جو رول ادا کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ کشمیر عظمیٰ کے ایکزیکیٹو ایڈیٹر جاوید آذر کے لئے میرے دل میں جو عزت اور محبت ہے، میں ''اپنی بات'' میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔ میں یہ کتاب جاوید آذر اور اپنے ایک اور عزیز دوست عمر مجید کی نذر کر رہا ہوں......!!

نور شاہ

سرینگر

ایک رنگین اور دل نشین کولاج

نورشاہ اُردو کے چابکدست، پختہ مشق اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں، میں اُن کو نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جانتا ہوں، اُن کی بول چال اور سُبھاؤ میں بڑی سہل پسندی ہے یعنی وہ فوراً گھل مل جاتے ہیں اور دوست بنالیتے ہیں، اُن کے افسانوں کے موضوع بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوتے ہیں۔ اور اُن کا بیانیہ بہت رواں دواں، مشکل الفاظ کے بوجھل پتھروں سے آزاد اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ اسی لئے اُن کے دوست بہت ہیں اور اُن کو پسند کرنے والے بے شمار، میں بھی اُن کا ایک خاموش مداح لیکن چست قاری رہا ہوں۔ زیرنظر کتاب افسانوں کی نہیں ہے اُن کے افسانوں کے کرداریوں تو زندگی کے بہت قریب ہوتے ہیں لیکن زیرِ نظر کتاب باقاعدہ گوشت پوست اور اپنے خاص نام اور کام رکھنے والے انسانوں کے خاکوں پر مشتمل ہے، کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ میں ایسے زندہ، تابندہ اور درخشندہ ہم عصروں کے جلوس کا ایک اہم قدم بن گیا ہوں جو یا تو نورشاہ کی طرح میرے بھی دوست تھے نہیں تو جاننے والے رہ چکے ہیں یا جن کے اچھے کاموں اور جن کی کارکردگی کو میں بھی اُن ہی کی طرح دیکھتا رہا ہوں۔ اور اس پر سر دھنتا رہا ہوں۔ نورشاہ نے اچھے سچے لوگوں کے اس مختصر کولاج کو بڑے سلیقے سے سجایا ہے اور یہ ہر حال میں اپنی دلکشی اور شرین نگاری کا قائل کرتے ہیں۔ میں نے اُن کی گنتی کرنا چاہی تو لگا کہ ایک چہرے کے پیچھے اور بہت سے چہرے اُبھرتے جاتے ہیں۔ کچھ ہمارے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں، کچھ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے اور ہمارے راز فاش کرتے ہیں کچھ ہماری بانہوں میں بانہیں ڈال کر ہمیں بچپن اور جوانی کی جولانیوں میں لے جاتے ہیں

پروفیسر محی الدین حاجنی اور مرزا کمال الدین شیدا، دینا ناتھ نادم اور پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ ہمارے اندر آج بھی تعظیم و تکریم کے جذبات اُبھارتے ہیں، کیسر سنگھ مدھوکر، بنسی نردوش، عابد مناوری نظروں کے سامنے آتے ہیں، اُن کے ساتھ دلچسپ گپ شپ، کھیل تماشوں اور شوخیوں وشرارتوں کی یادیں سلگنے لگتی ہیں، نور شاہ کے ان خاکوں میں تفصیلات کا وقوع نہیں ہے کہ اُن سے ہماری توجہ ہٹتی بٹتی رہے۔ یہ چند سطروں میں مذکورہ شخص کا آدم قد مرقع کھڑا کر دیتے ہیں، ان کی سہل پسندی اور دلنوازی پر یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اُنہیں محنت اور مشق کی کوئی کمی ہے، ان کا کینواس ضرور چھوٹا ہے مگر یہ بسوہلی کے میناتور (Miniature) کی طرح دلچسپ، تسکین بخش اور جُرعے میں پیاس بجھانے والی ہیں۔ ان میں پیچ داری بھلے ہی نہ ہو مگر ضربِ قلم کا ایسا زور ہے کہ چند نقوش (Strokes) ہی جیتن داس کے پنسل خاکوں کی طرح شخصیت کا جادو جگاتے ہیں اِن خاکوں کا بڑا گُن یہ ہے کہ اپنے اختصار اور پھر اپنی کشش کی وجہ سے انہیں قاری چند نظروں میں ہی پڑھ جاتا ہے، میری اطلاعات کے مطابق ان خاکوں کو شائع کرنے والے اخبار کے بہت سے شائستہ مذاق قاری اخبار میں پہلے نور شاہ کے کالم کو پڑھ کر اپنے ذہن شاداب کرتے ہیں اور پھر فرصت سے دوسرے کالموں کو دیکھتے ہیں۔

نور شاہ کی ان تحریروں میں شخصیات کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے بارے میں مقید حوالے ملتے ہیں اور اُن پر خاص محنت کی گئی ہے، خود میری معلومات میں بھی ان سے اضافہ ہوا اور بعض دفعہ اتنا کہ مجھے اپنے حوالوں کی ڈائری میں کچھ باتوں کو ٹانک دینا پڑا۔ شخصیات کے امتیاز کو اُبھارنے کے لئے دوسرے اہم قلم کاروں کی مختصر ہی سہی مگر بہت برجستہ آرائیں درج کی گئی ہیں اور کبھی کبھی تو کچھ ایسی سطریں پڑھنے کو ملتی ہیں جنہیں Quteaible quotes ہی کہا جاسکتا ہے اُن کی چاشنی

کا اندازہ کرنے کے لئے صرف دو ایک نمونے ......!

- وہ انقلابی سپاہی کی بندوق اور موسیقار کے ستار تھے۔
- اردو زبان کا ایک نام صابردت ہے۔
- ستیارتھی دنیا بھر کے لوگوں کے لئے لوک گیتوں کو جمع کر کے خود ہی ایک لوک گیت بن گیا ہے۔
- انارکلی بار بار پیدا ہو سکتی ہے لیکن مدھو بالا نہیں۔

کتاب میں ہر درجے اور ہر سطح کی شخصیات سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کچھ ایسے کہ وہ ہماری ذہنی تفریح کے جادوئی پٹارے کا حصہ ہیں جیسے ملکہ ترنم نور جہاں، فلم شعلے کا گبر سنگھ یعنی امجد خان، گلوکار محمد رفیع اور موسیقار اعظم نوشاد علی وغیرہ، کتاب کی ہر سطر ایک گلی بنتی ہے، جانے پہچانے چیزوں کی آوازیں ہماری توجہ کو مبذول کرتی ہیں اور اس کا ہر صفحہ ایک بازار، جس میں ہمارے دیکھے سُنے ہوئے بڑے لوگوں کے چہرے بشرے دیکھنے کو ملتے ہیں، نور شاہ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ان سب کو ہمارے حافظے کے بھولے بسرے طاقچوں سے نکالا ہے، اُنہیں نئی پوشاکیں پہنائی ہیں اور طرح طرح کی خوشبوؤں میں شرابور کرنے کے بعد اُنہیں ہمارے سامنے لایا ہے، اتنی خوش اندازی سے ہم اُن کو پہچاننے اور اُن کے اچھے کام یاد کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے ، یہ خاکے مقامی مگر موقر روزنامے ''کشمیر عظمیٰ'' میں ایک عرصے سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں، نور شاہ کبھی کبھی ان خاکوں کی توسط سے ایک پورے تہذیبی منظر کو کھولتے ہیں مثلاً لتا منگیشکر کے حوالے سے ہندوستانی فلموں کے سُر ساگر کی اور دینا ناتھ نادم کی معرفت سے کشمیر کے ادبی اور تہذیبی منظر نامے کی۔

اس کتاب کی یہ خوبی مجھے اچھی لگی کہ یہ آج کے چھوٹے موبائل فون سٹ کی طرح یوں تو چھوٹی سی لگتی ہے مگر اِس کے سوئچ بورڑ کے نیچے بہت سی مسرتوں اور معلومات کے سُر چھپے ہوئے ہیں کتاب کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے ہی کی نہیں پی جانے

کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ہمارے اُردو کے سکڑتے ہوئے حلقہ قارئین کو بڑھانے کے دم خم بھی رکھتی ہے اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال اور اس سے زیادہ لمبے عرصے میں ہمارے یہاں ابھرنے اور جدا ہونے والے اچھے لوگوں کو اُن کی آن بان کے ساتھ پھر ہمارے سامنے لایا گیا ہے اور وہ ہمارے کمزور حافظوں میں پھر ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔

ان خاکوں کی خوبی کی بات تو ہو چکی لیکن ان کے متعلق اگر کسی قاری کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس میں سارے کے سارے کردار تاباں اور رخشاں، سچے اور اچھے ہی نظر آتے ہیں حالانکہ ہم مٹی کے ماتے اکثر صورتوں میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے اطوار اور کردار رکھتے ہیں اور انسان کے قالب میں چھپا ہوا نورُ اسی کے پہلو میں چھپے ہوئے نار سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو اس کی معقولیت کو ٹالا نہیں جاسکتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ گذرے ہوئے دوستوں کی بھلائی کو اُبھارنا اخلاق اور آداب کا ایک اہم حصہ ہے اور پھر یہ نور شاہ کی تہذیبِ نفس کے علاوہ خوب گوئی کے تقاضوں کی بھی بازگشت ہے اکثر مقامات پر قاری کی زباں پر ہمارے مشاعروں کا وہ خوبصورت نعرہ آجاتا ہے...... مکرّر ارشاد...... باقی رہا اِن شخصیات کی کچھ کمزوریاں ہماری زبان تو اس معاملے میں قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے اور سارا حساب برابر کرتی ہے......!!!

محمد یوسف ٹینگ

T- 3
ٹلسی باغ۔سرینگر

1

ٹیکہ ٹٹی کا خالق ...... پردیسی

1924ء میں جموں سے لالہ ملک راج صراف نے اخبار رنبیر کی اشاعت شروع کی تو ریاست بھر کے قلمکاروں کو اپنی ادبی اور علمی صلاحیتیں اُبھارنے کا ایک موقعہ فراہم ہوا۔ ان قلمکاروں میں پریم ناتھ سادھو رونق بحثیت شاعر سرِفہرست تھے۔ اخبار ''رنبیر'' کے ساتھ ساتھ وہ اخبارِ عام میں لکھتے رہے اور رونق کے تخلص کے ساتھ ان کی شعری تخلیقات اس اخبار میں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں لیکن شاعری سے ان کا دل جلد ہی بھر گیا اور یہ میدان ان کو راس نہ آیا۔ شاید اس وسیلے سے وہ اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کا بھرپور انداز سے اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ انہوں نے نثر کی جانب توجہ دینی شروع کردی۔ ''کہانی'' کو اپنایا اور پریم ناتھ پردیسی کے نام سے کہانیاں لکھنے لگے۔

پردیسی اپنے ایک مضمون ''میرے افسانے'' میں لکھتے ہیں۔

''1924ء سے 1932ء تک میں نے شاعری کی
لیکن بعد میں اسے نفرت ہوگئی اور کہانیوں کی طرف مائل ہوا۔''

برج پریمی لکھتے ہیں کہ 1932ء کے بعد بھی پریم ناتھ پردیسی حسبِ ضرورت شعر کہتے رہے اور یہ سلسلہ 1950ء تک جاری رہا۔ برج پریمی نے اس کے ثبوت میں پردیسی کی ایک نظم کا حوالہ دیا ہے جو شاہکار لاہور میں دسمبر 1935ء میں شائع ہوتی تھی۔ وہ نظم یوں ہے

جب سے تم پہاڑ پر چلے گئے ہو
تب ہی سے
شام ہونے کے بعد

کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر
تمہیں یاد کرتی ہوں...... تمہاری پوجا کرتی ہوں
اور کبھی کبھی...... ہاں کبھی کبھی روتی ہوں
اس امید پر کہ تم واپس آ جاؤ
تو میرے آنسو پھول بن گئے ہوں
اور تمہارے پیروں کو اس سڑک پر چلنے کی تکلیف نہ ہو!!

آج بھی ہم جب کشمیر میں اُردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو آنجہانی پریم ناتھ پردیسی کا نام سامنے ابھر آتا ہے۔ شاید اس لئے کہ کشمیر میں اُردو افسانے کی شروعات پردیسی سے ہوئی ہے، اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی کشمیر میں اُردو افسانے کی بات پردیسی کا ذکر کئے بغیر مکمل نہیں ہوتی، ہو ہی نہیں سکتی۔ پردیسی کے افسانوں کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی مشہور و معروف اور معیاری جرائد میں شائع ہوئے اور پسند کئے گئے۔ ان جرائد میں ''ہمایوں'' اور ''ادب لطیف'' بھی شامل ہیں۔ جب ان کی کہانی ''ٹیکہ بٹنی'' ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور، کے سالگرہ نمبر (جنوری 1946ء) میں شائع ہوئی تو اسے بہترین کہانی قرار دیا گیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں صحیح معنوں میں کشمیر کی عکاسی کی ہے اور کشمیریت کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں جہاں کشمیر کی سندرتا نظر آتی ہے، وہیں انہوں نے کشمیر کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ بھوک کا احساس دلایا ہے۔ پردیسی کہتے ہیں کہ کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ ہے۔ جس کی جانب آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔ کشمیر کے معاشرے کو وہ پورے خلوص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، انہوں نے اپنی کہانیوں میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ ان میں سے اکثر موضوعات کا تعلق کشمیر اور کشمیریوں سے ہے، ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، وہ زندگی کا مشاہدہ ایک

ہمدرد انسان کی طرح کرتے ہیں۔

شمیم احمد شمیم پردیسی کو آزادی کے دور کا ایک ادیب تسلیم کرتے ہیں، ان کے مطابق پردیسی نے جو شاہکار افسانے قلم بند کئے ہیں وہ 1947ء کے پہلے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

شام وسحر

دنیا ہماری اور

بہتے چراغ

ماہنامہ ''رتن'' جموں سے شائع ہوتا تھا۔ اس کی ترتیب وتہذیب کا کام شانتی سروپ نشاط کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ بچوں کے لئے یہ رسالہ ملک بھر میں مقبول تھا، پردیسی اس میں بھی لکھتے تھے۔ پردیسی نے بچوں کے لئے جو کتابیں تحریر کیں ان میں چورنگی، چار بیٹے، جان باز بچے، کرنیں اور پوتی قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں نرسنگھ داس نرگس لکھتے ہیں کہ یہ کہانیاں بے حد دلچسپ اور موثر تھیں۔

1941-43ء کے دوران پردیسی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے، یہ سلسلہ 1948ء تک چلتا رہا، اس دوران وہ بحیثیت ایک کہانی کار معروف ہو چکے تھے۔ پھر کلچرل فرنٹ کا وجود عمل میں لایا گیا، پردیسی اس فرنٹ کے ایک سرگرم کارکن تھے۔

پردیسی نے کئی شاہکار ڈرامے بھی لکھے۔

بہر حال پریم ناتھ پردیسی نے اُردو کہانی کو جو وقار بخشا، وہ قابل تعریف ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں جب تک اُردو کہانی زندہ رہے گی، پردیسی کا نام بھی زندہ رہے گا...... اور آج کے دور میں ایک اُردو کہانی کار کے لئے یہ سب سے بڑا انعام ہے؟!!

۞۞۞

2

تیسری آنکھ سے دیکھنے والا قلمکار...... موہن یاور

بہت برس قبل جب میں پہلی بار جموں گیا تو میں نے کسی دوست سے جاننا چاہا کہ موہن یاور سے کب اور کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔

''اُردو بازار کے آس پاس ...... شام کے وقت''۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''لیکن میں کیسے پہچان سکوں گا''۔

''یار اُردو بازار میں جو شخص تمہیں سفید قمیض پاجامہ اور کالی شیروانی میں نظر آئے گا تو سمجھو وہی موہن یاور ہے''۔

اور اس طرح میں موہن یاور سے ملا اور پھر اس کی زندگی کی آخری سانس تک ہم ملتے رہے......!!

موہن یاور 1927ء میں جموں میں پیدا ہوئے، تعلیم بھی جموں میں ہی حاصل کی اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی جموں سے ہی کیا، 1947ء سے قبل لکھنا شروع کیا اور اپنے منفرد اندازِ تحریر سے اپنے پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ صحافت سے بھی ان کا گہرا تعلق رہا، زندگی کے آخری ایام میں وہ ہفت روزہ ''رفتار'' باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتے تھے، ان کا تعلق اخبار سندیش سے بھی رہا، وہ ماہنامہ سنگم کے مدیر بھی تھے۔ یہ ادبی رسالہ مرحوم نذیر حسین سمنانی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا اور اس میں ملک بھر کے معروف و مقبول قلم کاروں کی نثری اور شعری تخلیقات شائع ہوتی تھیں......!

موہن یاور کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

وہسکی کی بوتل ، سیاہ تاج محل اور تیسری آنکھ

ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے سیاہ تاج محل کو انعام سے نوازا گیا، موہن یاور نے ایک ناول ''پتھروں کا شہر'' بھی لکھا ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے ''جہلم اور توی'' کے عنوان سے ایک افسانوی کتاب بھی ترتیب دی ہے۔ جس میں ریاست بھر کے معروف کہانی کاروں کی کہانیاں شامل ہیں، یہ ریاست میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

موہن یاور کی کہانیاں ہندوپاک کے اکثر رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے انہوں نے کافی شہرت حاصل کرلی تھی۔ ان کہانیوں کے بارے میں چند تاثرات:

موہن یاور افسانہ نگاری کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔...... [آج کل، دلی]

سب سے زیادہ متاثر ان کے افسانوں کا لہجہ ہے جو رنگین اور بوجھل الفاظ سے پاک سادہ اور رواں دواں ہے...... [شاعر، بمبئی]

اپنے انداز نگارش کی شگفتگی اور سماجی شعور کی وجہ سے موہن یاور اُردو کے افسانہ نگاروں میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔...... [شاہراہ، دلی]

موہن یاور کے فن میں انفرادیت ہے، بے باکی ہے، توازن اور انسانیت کا گہرا خلوص ہے۔...... [نئے چراغ، کھڈوہ]

وہ ہر چیز کو اپنی نظر اور اپنے زاویے سے دیکھنے کا عادی ہے...... [چندن، دلی]

ہلکے ہلکے جملوں میں یکا یک کوئی گہری بات کہہ دینا، ان کا طرہ امتیاز ہے...... [شعلہ وشبنم، دلی]

موہن یاور ہر موضوع پر لکھتے ہیں اور معیاری ادب تخلیق کرتے ہیں...... [کردار، بھوپال]

افسانوی مجموعہ ''وہسکی کی بوتل'' کے پیش لفظ میں ٹھاکر پونچھی نے موہن یاور کو ایک عظیم سرکش باغی کے القاب سے یاد کیا ہے۔ برج پریمی لکھتے ہیں کہ موہن یاور کہانی کے فن پر قادر ہیں اور ان کے افسانے پڑھ کر فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

موہن یاور کے ادبی دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ریاست اور بیرون ریاست کے بہت سارے قلم کاروں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ فلموں کے لئے لکھیں لیکن ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی حالانکہ ان کے بہت سے دوست فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔

موہن یاور نے ریڈیو کے لئے بہت سے ڈرامے لکھے جن میں سے اکثر ریڈیو جموں سے نشر ہوئے۔

دیوندر ستیارتھی جب بھی جموں آتے تو وہ موہن یاور کے مہمان ہوتے تھے۔ ''تیسری آنکھ'' میں شامل افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ستیارتھی جی لکھتے ہیں:

''موہن یاور کو میں ایک نٹ راج کے روپ میں دیکھتا ہوں، اس کی تحریر میں اس صداقت کی چھاپ دیکھتا ہوں جو کسی بھی زبان کے ادب کو نئی زندگی بخشتی ہے۔''

کوثر چاند پوری اپنے زمانے کے مقبول کہانی کار تھے، آج بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''موہن یاور اپنے آس پاس سے کہانیوں کا مواد سمیٹ کر اور واقعات کی دنیا سے زندہ کردار منتخب کر کے انہیں فن اور تکنیک کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔......!''

اور بقول کشمیری لال ذاکر:

''مجاز میں لکھنوی بانکپن اور یاور میں ڈگر دیس کا تیکھا پن، یہ تیکھا پن

یاور کی کہانیوں کی جان ہے......"

کہتے ہیں جب راجندر سنگھ بیدی ریڈیو جموں سے وابستہ تھے تو انہوں نے ایک بار موہن یاور سے پوچھا...... "آپ شراب پیتے ہیں۔"

"نہیں"

اور "سگریٹ"

"نہیں"

"تو کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ افسانے پھر کیسے لکھ لیتے ہیں۔"

اس بات پر موہن یاور نے جو قہقہہ لگایا تھا اس میں بیدی صاحب کا قہقہہ بھی شامل تھا......!!!

❀❀❀

3

گیت، سنگیت اور......؟

وہ اب ہمارے درمیان نہیں لیکن اپنے جانے کے بعد بھی وہ ہمارے لئے ایسے نغمے چھوڑ گئے ہیں جو آج بھی لوگوں کے دلوں کو سرور و شادمانی بخشتے ہیں، دلوں کو غمناک اور آنکھوں کو نمناک کرتے ہیں، ان کا مدھر سنگیت آج بھی قطرہ قطرہ شہد بن کر ایک عجیب سی اَن دیکھی سی دنیا میں لے جاتا ہے اور اس الف لیلوی دنیا میں جذبات و احساسات کا دریا بڑی بے باکی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنا راستہ خود بناتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس دریا کے کنارے شعر و شاعری میں پوشیدہ ایک بہت ہی پیاری پیاری سی میٹھی میٹھی سی خوشبو کا احساس انسانی ذہنوں میں جاگتا ہے......!

پہلے وہ غلام نبی مینگنو تھا

پھر وہ غلام نبی ڈولوال بن گیا

اور پھر غلام نبی جانباز کشتواڑی!!

جی ہاں میں اسی جانباز کشتواڑی کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے گلاس کو ساز کے طور پر موسیقی میں شامل کر کے ایک نئی طرح ڈال دی۔ مختلف سازوں کے درمیان گلاس بجانے کی آواز کانوں سے ٹکرا کر سیدھے دل میں اُتر جاتی تھی اور پھر ایک سماں سا بندھ جاتا تھا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب چٹرجی صاحب ریڈیو کشمیر سرینگر کے ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے، نئے فنکاروں اور گلوکاروں کی تلاش کرتے کرتے وہ کشتواڑ جیسے دور دراز علاقے تک جا پہنچے، وہاں وہ ڈولوال صاحب سے ملے، ان کے رسیلے نغمات سے سرشار ہوئے اور ڈولوال صاحب کو اپنے ساتھ سرینگر لے

آئے اور اس طرح ریاست جموں و کشمیر کی موسیقی کی تاریخ میں ایک نئی آواز کا اضافہ ہوا، ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

اور یہ بات بھی درست ہے کہ جناب رسا جاودانی صاحب کے تحریر کردہ کشمیری نغمات کو ڈولوال صاحب نے اپنی آواز کے ذریعہ بستی بستی، شہر شہر اور گھر گھر پہنچایا۔

موتی لال ساقی لکھتے ہیں کہ ڈولوال کا جو پہلا نغمہ ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا وہ رسا صاحب کا ہی تحریر کردہ تھا اور یہ گانا اس قدر مقبول ہوا کہ چھوٹے بڑے بھی اسے تنہائی میں گنگناتے رہتے تھے اور پھر خواتین شادی کے موقعے پر ڈولوال کی نقل اتار کر چھکری کے روپ میں گاتی تھیں۔

یہ سلسلہ 1960ء تک چلتا رہا اور پھر ڈولوال صاحب نے دوسرے شعراء کے کلام کو بھی اپنی آواز دی، ان میں دینا ناتھ نادم، مظفر عازم اور موتی لال ساقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پھر ڈولوال صاحب کی زندگی کا ایک اور رُخ سامنے آیا، ان کے ذہن کے چشمے میں شاعری کے سوتے اُبل پڑے اور غلام نبی ڈولوال نے جانباز کشتواڑی کا روپ اپنا لیا، اس نئے روپ میں انہوں نے مدھر گیت لکھے، نغموں کو جنم دیا اور اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کئے۔ یہ انداز بے حد سراہا گیا۔

موتی لال ساقی مزید لکھتے ہیں کہ شعر و شاعری اور موسیقی تو جانباز کشتواڑی کی زندگی کا ایک اہم جز تھے ہی لیکن اس کے ساتھ وہ ایک رفیق شوہر اور شفیق باپ بھی تھے، وہ اپنے بچوں سے بے تحاشا پیار کرتے تھے۔ وہ ایک زبردست مہمان نواز بھی تھے اپنے عزیز دوستوں کا بے حد خیال رکھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

یوں تو جانباز کشتواڑی محکمہ جنگلات میں ملازم تھے اور وہ اپنی جائیداد اور مال و دولت میں اضافہ بھی کر سکتے تھے لیکن شاید ان کے اندر کا فنکار کسی اور دنیا کی تلاش میں تھا اور ان کے لئے یہ دنیا تھی شعر و شاعری کی دنیا، سنگیت اور نغموں کی دنیا...... اور شاید اس لئے ڈولوال صاحب کو اپنی زندگی میں مالی طور پر بہت سارے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی ان کے حوصلے میں نہ تو کوئی کمی آئی اور نہ ہی ان کا اعتماد لرز اٹھا بلکہ اس ناموافق ماحول میں ان کی آواز میں درد و کرب آ گیا اور اسی درد و کرب نے انہیں شہرت دی، مقبولیت دی۔

اپنے ایک خط میں انہوں نے موتی لال ساقی کو لکھا تھا:......

''زندگی کا ذکر کہاں تک کروں، میری زندگی میں کچھ اور نہیں۔ میری زندگی میری موسیقی ہے، میری شاعری ہے۔ میں نے اپنی روح کو پُر سکون دیکھا　ستاروں　　تاروں میں اور اپنی زندگی پائی موسیقیت سے بھری شاعری میں......''

میرا شوق میرا پیشہ نہ سمجھو
یہ میری خودی کو گوارہ نہیں ہے۔''

غلام نبی ڈولوال جانباز کشتواڑی اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی آواز آج بھی زندہ ہے ان کی شعری تخلیقات پڑھ کر یا ان ہی کی آواز سن کر شہد کی مٹھاس کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے نغمے آج بھی دلوں کی غمناک اور آنکھوں کو نمناک بناتے ہیں...... اس لئے فنکار کی موت نہیں ہوتی اور اب اس مرحوم فنکار کی شہرت اور مقبولیت میں اپنی آواز کے جادو سے اضافہ کر رہی ہیں ان کی بیٹی جہاں آراء جانباز......!!

✿✿✿

4

اختر محی الدین ...... تجھے کہاں سے لاؤں؟

17/اپریل 1928ء تا 22/مئی 2001ء

22/مئی 2001ء، ریاست کے معروف اور بلند قامت کہانی کار اختر محی الدین کی زندگی کا آخری دن تھا، اپنے چاہنے والوں سے جدا ہوئے انہیں اب چھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی کشمیری کہانی کاروں میں ان کا نام سرفہرست ہے، وہ آج بھی کشمیری کہانی کے معمار تسلیم کئے جاتے ہیں اور جب تک کشمیری زبان میں کہانیاں لکھی جائیں گی۔ اختر محی الدین کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا یہ بات قابل ذکر ہے کہ اختر محی الدین نے اس وقت اُردو میں لکھنا ترک کیا جبکہ وہ قومی سطح پر اپنی اُردو کہانی ''پونڈر ریچ'' پر انعام پا چکے تھے، اختر نے کشمیری زبان وادب کو وسعتیں عطا کی ہیں اور اب یہ وسعتیں کشمیر کی ادبی، ثقافتی اور علمی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں..... آج ان کی یاد میں ان کی تین مختصر کہانیوں کا اُردو روپ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں!!

انجام

لسہ خان کی بڑی بیٹی جلی نے چودھویں جماعت پاس کرنے کے بعد جج بننے کی ڈگری حاصل کر لی تھی اور اپنے پرانے بوسیدہ مکان کے دروازے پر ایک بورڈ بھی آویزاں کر رکھا تھا..... جلیلہ رسول خان، بی اے ایل ایل بی!!

لسہ خان کو یہ بورڈ جیسے اپنے ماتھے پر چمکتے ہوئے تارے کی مانند لگ رہا تھا۔ اس دن شہر میں کرفیو تھا اور سڑک پر فوجیوں کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جلی اپنے گھر کے دروازے کے قریب آئی اور فوجی افسر سے کہا۔

''بھائی صاحب میرے پتا جی کو سڑک کے اُس پار جانا ہے، آپ کی اجازت ہے، ان کو پھر واپس آنا ہے۔''

فوجی افسر نے پہلے لسہ خان کی جانب دیکھا اور پھر جلی پر آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے کہا...... ''ہاں ہاں جاؤ چاچا''۔

لسہ خان سڑک پار کر گیا اور جلی نے مسکراتے ہوئے دروازے پر لٹکے بورڈ کی جانب دیکھا اور پھر گھر کے اندر چلی گئی۔

قریب قریب ایک گھنٹے کے بعد باہر شور سنائی دیا اور ایک آواز اُبھری۔

''او بوڑھے اِدھر آ جاؤ''

جلی نے آواز سنی اور جلدی سے باہر آئی، کوئی دوسرا فوجی آفیسر لسہ خان کو بے تحاشا پیٹ رہا تھا۔ جلی دوڑتی ہوئی اپنے باپ کے قریب جا پہنچی اور اپنے باپ کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''کیوں مارتے ہو میرے ابو جی کو، تمہارے ہی آفیسر نے اس کو سڑک پار کرنے کی اجازت دی تھی۔''

''لڑکی بکواس بند کرو، چلی جاؤ یہاں سے''۔ فوجی آفیسر نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

جلی نے واپس کہا...... ''تمہارے ماں باپ بہن نہیں کیا۔ بکواس تم کر رہے ہو۔''

اچانک پہاڑوں کی اوٹ سے جیسے کوئی بجلی گری۔ ایک زوردار بجلی اور جلی نیچے گر پڑی......!!

دوسرے دن جب کرفیو اٹھایا گیا تو لسہ خان روتے روتے سڑک پر کچھ تلاش کرر ہا تھا اور ساتھ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا...... ''جلی بیٹی کے چھوٹے چھوٹے دانت یہیں کہیں گر گئے ہونگے۔''

☆☆☆

آتنک وادی

جس گلی سے آپہ لالہ کا گذر ہوا وہاں سے ایک گشتی پارٹی آ رہی تھی، آٹھ سالہ پرنس کی نظر جونہی فوجیوں پر پڑی تو رونے لگا۔ آپہ لالہ نے چُپ کرانے کی کوشش کی لیکن بے سود، وہ روتا رہا اور جانے کس بات پر ضد کرتا رہا، فوجی آفیسر یہ سوچ کر رُک گیا کی بچہ انہیں دیکھ کر شاید ڈر گیا۔ قریب آ کر کہا ''ڈرو نہیں بیٹا، ڈرو نہیں۔''

''یہ ڈرتا نہیں''۔ آپہ لالہ نے کہا۔

''پھر کیوں رو رہا ہے۔''

''بولتا ہے گن دیدو، جب کسی فوجی کو دیکھتا ہے بولتا گن دیدو۔''

''آتنک وادی سالا'' یہ کہتے ہوئے فوجی آفیسر آگے چل دیا!!

☆☆☆

اندھیرا

ہر سمت اندھیرا تھا۔ نہ کمرے کے اندر بجلی کی روشنی تھی اور نہ باہر چاند۔ اور نہ اس کی چاندی دفعتاً آنگن میں چلنے کی صدا گونجی۔ میری بیوی خوفزدہ ٹانگوں سے اُٹھی اور کھڑکی کے قریب جا کر پہلے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا اور پھر شیشے سے باہر ڈری ڈری نظروں سے دیکھا، کچھ دیر تک دیکھتی رہی اور پھر لوٹ آئی۔ ''کتنے ہیں''۔ میں نے پوچھا

''جانے کتنے ...... شمار نہ کر سکی''۔

اچھا یہ تو بتاؤ ''وہ تھے یا یہ میرا مطلب ہے وردی پوش یا نقاب پوش۔''

''دیکھتے ہوئے بھی جیسے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس لئے خاموش ہوں''

❁❁❁

5

کرب ریزے

اگست 1998ء کی بات ہے، میں دہلی میں تھا اور 29/اگست 1998ء کو میں مٹیا محل اُردو بازار جامع مسجد ماہنامہ بیسویں صدی کے دفتر رحمان نیر صاحب اور اُن کی بیگم ڈاکٹر شمع افروز زیدی سے ملنے چلا گیا، دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نہ تھا البتہ میں نے دیکھا کہ دفتر کے ایک کونے میں ایک شخص کاغذات دیکھنے میں مصروف ہے، انہوں نے میری طرف دیکھا اور دور سے ہی کہا:

''آیئے نور صاحب''

میں جب اُن کے قریب گیا تو انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''دیکھئے میں نے آپ کو پہچان لیا لیکن آپ مجھے نہیں پہچان سکتے۔ میرا نام شاہد پرویز ہے......''

''شاہد پرویز...... کہانی کار......''

''جی ہاں''

وہ اس وقت بیسویں صدی کے آئندہ شمارہ میں شائع ہونے والے مواد کا انتخاب کر رہے تھے اور ترتیب دے رہے تھے، کہنے لگے:

''ابھی ابھی پشکر ناتھ کی کہانی پڑھ رہا تھا اور آپکے نزدیکی ہمسایہ کی غزل دیکھ رہا تھا۔''

''میرا ہمسایہ...... آپ غلام نبی خیال کی بات کر رہے ہیں نا...... وہ بھی راولپورہ میں ہی رہتے ہیں۔''

''جی نہیں، خیال صاحب کی نہیں فرید پربتی کی بات کر رہا ہوں، وہ بھی تو آپ ہی کے علاقے میں قیام پزیر ہیں...... کیا خوب لکھتے ہیں۔''

''جی ہاں''

یہ شاہد پرویز افسانہ نگار سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

سید شاہد حسن رضوی شاہد پرویز کے نام سے لکھتے تھے، اُن کا آبائی وطن رام پور تھا وہ ریاست ٹونک (راجستھان) میں 18 نومبر 1938ء کو پیدا ہوئے تھے، اُن کی پہلی کہانی 1956ء میں روزنامہ ''ناظم'' رام پور میں شائع ہوتی تھی، وہ ایک صحافی بھی تھے اور انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ ''الجمعیۃ'' سے کیا اور بعد میں روزنامہ ''نئی دُنیا'' اور بندے ماترم سے بھی منسلک رہے، ماہنامہ ''عکس'' اور ماہنامہ ''سریتا'' (اُردو) سے بھی اُن کا تعلق رہا، میری ملاقات کے وقت وہ ماہنامہ ''روبی'' اور ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کیلئے کام کررہے تھے، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے انہوں نے ویکلی اخبار ''سات دن'' اور ماہنامہ ''تیز گام'' کی اشاعت شروع کی تھی لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

شاہد پرویز کا پہلا اور آخری افسانوی مجموعہ ''کرب ریزے'' فروری 1991ء میں شائع ہوا تھا، یہ مجموعہ 24 افسانوں پر مشتمل ہے، اِن کے چھ ناول بھی شائع ہو چکے ہیں اُنکا ایک ناول کھلی آنکھ کا سپنا اُردو، ہندی اور گجراتی میں شائع ہوا ہے، اُن کے دوسرے ناول ہیں: زمین زاد (اُتر پردیش اُردو اکادمی سے انعام یافتہ) لہو کا رنگ، سماج، دلہن بانو اور اقراء......!!

افسانوں اور ناولوں کے علاوہ انہوں نے ریڈیائی ڈرامے، فلمی اور ادبی شخصیتوں کے انٹرویوز اور مضامین بھی لکھے ہیں اور بقول جوگندر پال...... ''شاہد پرویز کو پڑھ کر میں اُن کے فن کی مذکر صفت خصوصیات سے خاص طور پر متاثر ہوا ہوں، اُن کے افسانوی تناؤ کے اسباب اس قدر بنیادی اور عمودی ہیں کہ قاری کے روبرو اپنی اٹل شبیہوں میں رونما ہوتے چلے جاتے ہیں''۔

علی باقر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''شاہد پرویز کی کردار نگاری میں واقعہ پسندی ہے، ان کی کہانیاں

ہمارے ماحول، ہماری زندگی اور ہمارے سماج کی آئینہ دار ہیں، اُن کے کردار گناہ کے تصور سے دور بھی نہیں اور گناہوں میں شرابور بھی نہیں، اُن کی کہانیوں میں جب عورت گناہ کرتی ہے تو مرد کے مقابلے میں زیادہ گناہگار نظر آتی ہے، وہ مشرقی اقدار کے بڑے مداح ہیں۔"

اُن کی کہانی "چاندنی رات" سے چند جملے......

"گرو یہ چھوکری فلم لین (لائن) میں گھس گئی تو سمجھو پبلک کا کباڑا ہو جائے گا ،لوگ دیوانے ہو جائینگے اسے دیکھ کر..... کیا رس ہے سالی میں......!"

مخمور سعیدی کی نظر میں شاہد پرویز کے افسانوں کی بنیاد بیان و واقعات پر ہے لیکن یہ واقعات وہ حقیقی زندگی سے لیتے ہیں۔

اُن کی ایک اور کہانی شہزاد، شہزادی اور عفریت سے چند جملے......

"منصور کی طرف سے اس کی پشت تھی، سفید زمین پر بڑے بڑے پھولوں والی جارجٹ کی ساڑھی میں اُس کے گداز کولہے منصور کو خاصے پرکشش لگے، گردن کے پاس سے بلاؤز کے پیچھے حصے کا کٹاؤ اتنا زیادہ تھا کہ دونوں شانوں کے درمیان کی گلابی جلد شیشے کی طرح دمک رہی تھی اور بھورے بالوں کی موٹی سی چوٹی کمر کے نیچے تک بڑی بے ترتیبی سے لہرا رہی تھی......"

شاہد پرویز کی تحریر کردہ آخری کہانی اب سے چند برس قبل ماہنامہ یوجنا (دہلی) میں شائع ہوئی تھی، بے حد خوبصورت کہانی تھی اور ایک اچھوتے موضوع سے تعلق رکھتی تھی۔ کہانی کا عنوان میرے ذہن سے اُتر چکا ہے اور اس کہانی کے بعد وہ خود بھی ایک کہانی بن گئے اور ہمیشہ کے لئے اِس دنیا سے رخصت ہو گئے......!!!

✿✿✿

6

نادم یگ

میں افسانوں کی دنیا میں نیا نیا آیا تھا اور شاید ایک دو ہی افسانے شائع ہوئے تھے کہ دینا ناتھ نادم سے اُن کے گھر میں ملنے کا موقع ملا، اُن دنوں وہ ایک سرکاری کوارٹر میں قیام پذیر تھے، میری ملاقات کے وقت وہاں غلام رسول سنتوش اور مہیندر رینہ بھی موجود تھے اور بھی دو تین لوگ تھے جنکے چہرے میرے ذہن سے اُتر چکے ہیں، سنتوش نے میرا تعارف کرایا اور نادم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ...... ''سرینگر میں آپ کہاں رہتے ہیں، مکان کیسا ہے، بناوٹ نئی یا پرانی طرز کی ہے، کیا آپ اپنے مکان کی کھڑکی سے شنکرآچاریہ کا مندر دیکھ سکتے ہیں، ڈل جھیل آپ کی بستی سے کتنی دوری پر ہے، محلے میں کیسا ماحول ہے، لوگ کیسے ہیں......'' میں ایک ایک بات کا جواب دیتا رہا لیکن سوچ بھی رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ پوچھنے کا مقصد کیا ہے، کیونکہ عمر میں، میں اُن سب سے چھوٹا تھا اور ادبی حلقوں میں جان پہچان بھی نہ تھی اسلئے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا لیکن مہندر رینہ نے یہ سب جاننے کی وجہ پوچھ ہی ڈالی، نادم صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا:

حال ہی میں ان کا ایک افسانہ نظر سے گذرا، میگزین کا نام تخلیق تھا، کوئی صاحب ملنے آئے تھے، جاتے سمے وہ اپنا رسالہ لینا بھول گئے، سرینگر کا ایڈریس دیکھ کر افسانہ پڑھنے کا اشتیاق بڑھا، یہ افسانہ پڑھ کر مجھے لگا جیسے افسانہ نگار اپنے ماحول اور اپنے آس پاس سے مطمئن نہیں ایک تشنگی کا احساس اُبھرتا ہے، اس لئے اپنی جان کاری کے لئے یہ سب کچھ پوچھ ڈالا''

نادم صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اسکے بعد بہت بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا، انکو مشاعروں میں سنا، ان کے ساتھ بہت سی محفلوں میں شرکت کی، کئی بار ہندو ہائی سکول جا کر اُن سے ملا، جب وہ ڈائریکٹر آ ڈلٹ ایجوکیشن تھے تب ہی ملتا رہا کبھی اکیلے اور کبھی اُنکے چاہنے والوں کے ساتھ۔ البتہ جتنی دیر وہ قانون ساز کونسل کے ممبر رہے، اُن سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا، وہ بے حد مصروف رہتے تھے۔

میں نے پہلی بار ایس پی کالج کے کھلے میدان میں منعقد ایک مشاعرے کے دوران اُن کا کلام سنا، کوئی آزاد نظم سنا رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے زور زور سے بادل گرج رہے ہوں، اُن کی گرجدار آواز کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا ہر طرف خاموشی تھی، یہاں تک کہ شمیم احمد شمیمؔ جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے، بھی خلاف معمول خاموش تھے۔ اُن کے شعر سنانے کا انداز واقعی جداگانہ تھا، مختلف تھا، ایسا لگتا تھا جیسے الفاظ کا ایک دریا ہے جو آہستہ آہستہ سسک روی کے ساتھ بہتا چلا آ رہا ہے۔ نادم صاحب نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈالی، ایک نئے ڈکشن کو جنم دیا، نئے اور سنجیدہ موضوعات کو اپنی شاعری میں اُبھارا، نئی ہیئتیں وجود میں لائیں، آزاد نظم، بلیک ورس، سانٹ اور اوپیرا کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترجمانی کی۔ نادم صاحب کو زندگی کے جن تجربات سے گذرنا پڑا وہ تجربات اور مشاہدات اُن کی شاعری کا ایک حصہ بنے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی شاعری اُن کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ آج بھی ہمارے سماج، ہماری سوسائٹی، ہمارے رہن سہن اور ہماری تہذیب وتمدن کا ایک حصہ نظر آتی ہے اور بقول سوم ناتھ زتشی:

> ''نادم صاحب کی ہر کوئی تخلیق بجائے خود ایک اکائی ہے، جمالیات اور پیکر تراشی کا خوبصورت اظہار ہے۔''

نادم صاحب کا لکھا ہوا اوپیرا ''بونبر ہو یمبر زل'' بہت مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت آج بھی قائم و دائم ہے، یہ اوپیرا روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا اور سویت یونین میں سٹیج بھی کیا گیا۔ ان کے شعری مجموعہ ''شہلی کُل'' پر ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نادم صاحب نے چار سو سے زائد نظمیں، غزلیں، سانیٹ اور ہائیکو وغیرہ تخلیق کئے۔ اُن کی شعری تخلیقات آفاقی موضوعات سے جڑی ہوئی ہیں، اُن میں گہرائی ہے اور ٹھہراؤ بھی، ان کے ہاں ذخیرہ الفاظ کا ایک وسیع سمندر ہے، اُن کی نثری تخلیقات میں اُن کے تحریر کردہ افسانے جوابی کارڈ اور شینہ پیتو پیتو قابل ذکر ہیں۔

نادم صاحب خیالات میں ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے غلام محمد صادق کے بہت زیادہ قریب رہے۔ وہ بخشی غلام محمد اور ڈی پی در کے بھی قریب رہے۔ غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، مہندر رینہ، علی محمد لون، پی این پشپ، پران کشور، رحمان راہی، پی این کاچرو، شمیم احمد شمیم اور موتی لال ساقی اُن کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

نادم صاحب 18 / مارچ 1916ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے، ان کے پتاجی پنڈت شنکر کول 23 / مئی 1922 کو مر گئے، اُس وقت نادم صاحب کی عمر صرف چھ برس تھی، اس لئے نادم صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں اُن کی ماں کا بڑا حصہ رہا...... وہ پہلے انگریزی، ہندی اور اُردو میں لکھتے رہے لیکن 1946ء میں اپنی مادری زبان کشمیری کو ہمیشہ کیلئے اپنا لیا......!!

اپنی ایک نظم ''مے چھُم آش پگہچ'' (مجھے آشا ہے کل کی) کے بارے میں نادم صاحب کے خیالات:

> ''یہ نظم مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے، اس نظم کا موضوع عالمگیر امن پسندی اور انسان دوستی، اپنے وطن کی حسین وادیوں، مترنم جھرنو اور محنت کش عوام کی دلگیر مسکراہٹوں، اپنے ماضی کی شاندار کلچر روایت اور اپنے یہاں کے تصوف خودشناس لٹریچر اور معصوم لوک گیتوں اور لوک

سنگیت سے پا چکا ہوں۔ اسلئے امن پسندی اور انسان دوستی اپنی
شاعری میں کوئی جدت تصور نہیں کرتا بلکہ اپنی میراث کا اعادہ لیتا ہوں
، زندگی کے متعلق میرا ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ یہ دب کر بھی شکست
نہیں کھاتی ، پیچھے نہیں ہٹتی ۔ ہر گام پر بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر فتح
یاب ہوتی ہے، زندگی کی یہ بے باکی یہ آگے بڑھ کر فاتح بننے کی جہد
ہی اس کا سب سب بڑا حسن ہے جو ایک شاعر کے جمالیاتی ذوق کو
اُکساتا ہے، رات کی مہیب ترین تاریکی بھی صبح کی امید پر مسکراتی
ہے وہ صبح جبکہ تمام تاریکی کافور ہو جائے گی ۔ تمام آلام دور ہو جائیں
گے اور تشنہ لب ارمانوں کی پیاس بجھ جائے گی، اس صبح کی امید سے
میں بچپن سے واقف ہوں اس کے حسین خدوخال سب میرے
جانے پہچانے ہیں، میں نے اس کو کشمیر کے کھیتوں میں دیکھا ہے دریا
کے کنارے ہانجیوں کے پژمردہ چہروں پر دیکھا ہے......!!''

نادم صاحب اب اس دنیا میں نہیں لیکن ''نادم یگ'' اب بھی زندہ
ہے......!!!

❁❁❁

7

جاسوسی دُنیا کے خالق

جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی سے ایک بار پوچھا گیا کہ ایشا میں بھی کوئی قابل ذکر جاسوسی ناول نگار موجود ہے تو انہوں نے کہا کہ برصغیر میں رائج زبانوں سے واقف تو نہیں لیکن میں نے ابن صفی کا نام ضرور سنا ہے۔.....اس ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا اور وہ اُتر پردیش کے ایک گاؤں نارہ میں 1924ء میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ایک مزاح نگار اور شاعر کی حیثیت سے کیا تھا اور اسرار ناروی کے نام سے لکھتے تھے۔

1948ء میں مشہور قلمکار عباس حسینی نے نکہت نامی ایک میگزین کی اشاعت شروع کی، یہ ماہنامہ چند ہی برسوں میں کافی مقبول ہوا، اُس زمانے کے معروف قلمکاروں کی تخلیقات اس جریدہ میں شائع ہوتی تھیں اور پھر 1958 میں نکہت میں ہر ماہ ایک جاسوسی ناول شائع کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ یہ جاسوسی ناول لکھنے کے لئے اسرار ناروی اور راہی معصوم رضا کے ناموں پر غور کیا گیا، فیصلہ اسرار ناروی کے حق میں ہوا۔ انبساط احمد علوی لکھتے ہیں کہ شروع میں اسرار ناروی نے یہ جاسوسی ناول ماہنامہ نکہت کے لئے اپنے والد صفی ناروی کے نام سے لکھے، وجہ یہ تھی کہ اُردو کے ناقدین جاسوسی ناول نگاری کو ادب عالیہ کا حصہ ماننے سے انکار کرتے تھے، بعد میں یہ نام ابن صفی کے نام میں تبدیل ہو گیا اور پھر اس نام کو ایک جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ویسے نام بدلنے کی عادت ابن صفی کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ کسی زمانے میں طغرل فرقان کے نام سے بھی لکھتے تھے لیکن ایک جاسوسی ناول نگار کی

حیثیت سے انہیں جو مالی فائدہ ہوا اس کے پیش نظر اسرار ناروی اور طغرل فرقان کے ناموں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں رہی۔ ایک سروے کے مطابق کرشن چندر کے بعد ابن صفی برصغیر میں سب سے زیادہ چھپنے والا ادیب قرار دیا گیا ہے۔ ہر ماہ ایک نئی تھیم یا پلاٹ کے ساتھ ناول لکھنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ابن صفی یہ کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے......!!

ماہنامہ نکہت تو شائع ہوتا رہا لیکن اس کے ساتھ ہی 1958 میں ماہنامہ جاسوسی دنیا کی اشاعت شروع کر دی گئی اس طرح ابنِ صفی اپنے پڑھنے والوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ کرنے میں کامیاب رہے، اس بسیار نویسی کے باوجود انہوں نے فنی معیار کو گرنے نہیں دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جاسوسی لٹریچر بھی ادب عالیہ کا حصہ بن سکتا ہے۔ ان کے اردو میں لکھے گئے جاسوسی ناولوں کا ترجمہ جب ہندی اور بنگالی میں شروع ہوا تو ان زبانوں میں بھی ان کی تصنیفات کافی مقبولیت حاصل کر گئیں۔ بہت سارے اشاعتی اداروں نے جاسوسی ناول شائع کرنے شروع کر دیئے لیکن یہ ناول ابن صفی کے تحریر کردہ ناولوں کے سامنے ٹک نہ سکے۔

جاسوسی دنیا اب بند ہو چکا ہے، آج بھی جاسوسی ناول لکھے جا رہے ہیں اور شائع بھی ہو رہے ہیں لیکن ان میں سے اکثر انگریزی زبان سے ترجمہ ہو کر پڑھنے والوں کے سامنے آتے ہیں۔ ابن صفی نے اپنی جاسوسی کہانیوں کے ذریعہ جن کرداروں کی تخلیق کی وہ اگرچہ فرضی تھے لیکن جاسوسی دنیا کے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں آج بھی زندہ جاوید ہیں.....فریدی، عمران، حمید، جوزف، مسلمان اور قاسم علی کے کردار اُن کے چھان بین کرنے کا انداز اور ان کی آپسی گفتگو آج بھی ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کو پڑھنے والوں کے لئے فراموش کرنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے۔ یہ کردار تخلیق کرتے وقت ابن صفی کے ذہن میں نہ تو ہندوستان تھا اور نہ ہی پاکستان۔ پاکستان کی شہریت اختیار کرنے کے باوجود انہوں نے کبھی

بھی اپنے فن کو جغرافیائی حدود میں محدود کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی جاسوسی کہانیوں میں ایک ایسا سماں باندھتے تھے کہ سب کچھ اصل نظر آتا تھا، ان کہانیوں میں ایک نیا پن ہوتا تھا اور سائنسی تحقیق اور نقطہ نظر کی ترجمانی ہوتی تھی، ان کی تحریریں چاشنی سے بھرپور ہوتی تھیں اور ان جاسوسی ناولوں کے اختتام ہمیشہ چونکا دینے والے ہوتے تھے۔ کبھی بھی اور کسی بھی ناول کا پلاٹ دوسرے ناول کے پلاٹ سے نہیں ملتا تھا۔ ہر ناول کا اپنا ماحول ہوتا تھا، اپنی کہانی ہوتی تھی۔ اپنا اسلوب ہوتا تھا۔

ابن صفی کے بہت سارے جاسوسی ناول اس قابل تھے کہ انہیں آسانی کے ساتھ انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ان کی اہمیت میں اضافہ کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا آج تک نہیں ہوا، شاید ابن صفی کو بھی اس سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ابن صفی 1980ء میں انتقال کر گئے ان کے انتقال کے بعد ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے اخباروں اور جرائد میں اُن کے تعلق سے بے شمار مضامین شائع ہوئے ان مضامین کی تعداد دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن صفی کس قدر مقبول اور معروف تھے...... اور پھر اگاتھا کرسٹی کا ابن صفی کے بارے میں غائبانہ تاثرات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ابن صفی ایک قابل ذکر اور قد آور شخصیت کے مالک تھے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ ریاست جموں و کشمیر کے بہت سارے قلمکار چاہے وہ حیات ہیں یا یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے تھے، انہیں بھی میری طرح ہر ماہ جاسوسی دنیا کا انتظار رہتا تھا......!!!

✿✿✿

8

ستارو رات بیتی جارہی ہے

لگ بھگ اٹھائیس برس قبل ہمارے نوجواں قلمکار اور صحافی جاوید آذر نے ''رسا جاودانی کے نام چند خطوط'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس مضمون میں شامل خطوط پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ رسا صاحب کی صلاحیتوں اور شعری تجربات سے حفیظ جالندھری جیسے بلند قامت شاعر بھی معترف تھے۔

رسا جاودانی کا تعلق بھدرواہ سے تھا، بھدرواہ اپنی خوبصورتی، سندرتا اور دلکشی کے لئے چھوٹا کشمیر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ہر طرف ہریالی ہے، دیودار اور چڑھ کے بے شمار درخت ہیں، بلند پہاڑ اور فلک بوس چوٹیاں ہیں، قدرت کی رعنائیاں ہیں اور اسی بھدرواہ میں عبدالقدوس رسا جاودانی 1901ء میں پیدا ہوئے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُستاد کا پیشہ اختیار کیا اور پھر اُردو اور کشمیری زبانوں کی جھولی کو اپنے سحر آفریں شعروں سے مالا مال کردیا۔ 1940ء تک وہ صرف اردو زبان میں شعر کہتے رہے پھر کشمیری زبان کو بھی اپنالیا۔ اُردو کے ساتھ ساتھ کشمیری میں بھی شعر لکھنے شروع کردیئے جو مرتے دم تک قائم رہا۔

27رمئی 1979ء کو یہ شمع ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی!

اپنی زندگی میں رسا جاودانی کلچرل اکادمی کی سنٹرل کمیٹی اور جنرل کونسل کے ممبر رہے، اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اکادمی سے انہیں 1962ء میں خلعت فاخرہ سے بھی نوازا گیا۔

اُردو زبان و ادب کے معروف قلمکار اسد اللہ وانی لکھتے ہیں ''رسا صاحب نے جس دور میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اس دور میں بھدرواہ میں نہ

کوئی ادیب تھا اور نہ ہی کوئی انجمن، غرض ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے یا جلا بخشنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ رسا صاحب کی مادری زبان کشمیری تھی مگر انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو سے کیا اعلیٰ پایہ کی شاعری کی۔''

ستارو رات بیتی جارہی ہے		وہ مرا مست خواب آئے نہ آئے

کہتے ہیں کہ 1931ء میں بھدرواہ میں ایک زبردست طوفان آیا تھا، مال جائیداد اور زمین زراعت کا بہت نقصان ہوا۔ لوگ بے گھر ہو گئے، اس طوفان کے پسِ منظر میں رسا جاودانی نے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بے حد مقبول ہوئی...... موتی لال ساقی کی نظروں میں رسا صاحب صحیح معنوں میں اہلِ زبان تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کشمیری زبان کے صوتی آہنگ اور اتار چڑھاؤ نے رسا صاحب کی شاعری کو ایک الگ رنگ اور روپ عطا کیا ہے۔

تو نقاب اُلٹ دے تو ہو سحر		تری زلف بکھرے تو نیم شب
یہی اپنے لیل و نہار ہیں		یہی صبح یہی شام ہے
جہاں تیرا نقش ملا		وہیں سرِ سجدہ پڑے رہے
یہاں عاشقوں کی نماز میں		نہ رکوع ہے، نہ قیام ہے

رسا جاودانی کا کشمیری کلام ''نیرنگ غزل'' اور ''تحفہ کشمیر'' نامی کتابوں میں شائع ہوا۔ ان کے اُردو کلام کے دو مجموعے ''لالہ صحرا'' اور ''نظم ثریا'' شائع ہو چکے ہیں۔

شب کو بوتل شراب کی پی کر		صبح اُٹھتا ہوں پارسا ہو کر

رسا صاحب نے اپنی ساری زندگی نہایت سادگی سے بسر کی، وہ بے حد مخلص انسان تھے، صوفیانہ ڈھنگ اپنا کر انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ادبی ماحول میں گذارا۔ اُن کی طبیعت میں جو نفاست، لطافت اور نزاکت تھی وہ اُن کی

شعری تخلیقات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ بھائی چارے اور انسان دوستی کے علم بردار تھے۔

ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انسان
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ کوئی مسلمان

رسا صاحب کا ایک اور شعر ہے۔

کبھی نہ مسجد و مندر میں امتیاز کروں
بتوں کی کر کے پرستش ادا نماز کروں

رسا جاودانی کے کشمیری اور اُردو کلام کو غلام نبی ڈولوال نے اپنی آواز دے کر زندہ بنا دیا، یہ آواز آج بھی سریلی ہے، پرسوز اور پُر درد ہے۔

ان دنوں رسا جاودانی میموریل کمیٹی رسا صاحب کے نام کو روشن کرنے کیلئے بہت اہم ادبی کام انجام دے رہی ہے۔

رسا جاودانی کے نام اپنے ایک خط میں معروف شاعر پورن سنگھ ہنر لکھتے ہیں...... ''آپ کا کلام لالہ صحرا دیکھنے کا اتفاق ہوا تو بے ساختہ زبان سے یہ فقرہ نکلا ،ایسے غیر ادبی علاقے میں ایک صاحب طراز اور خوشگو شاعر پیدا ہو سکتا ہے، سبحان اللہ کیا عجیب مطلع ہے۔

کہنے کو رسا سب کہتے ہیں اُن تک رسائی ہو نہ سکی
کیا نام سکندر رکھنے سے جب بخت سکندر ہو نہ سکا

❁❁❁

9

بہارِ غزل سے شمیمِ گُل تک

کسی زمانے میں ، میں اور حکیم منظور (مرحوم) گاندھی نگر جموں میں سرکاری کواٹروں میں ایک دوسرے کے بہت نزدیک رہتے تھے، اُن کا قیام 9 سی میں تھا اور میرا 30 سی میں ، دونوں کوارٹروں کے درمیان آنجہانی نریندر شرما (ڈپٹی سکریٹری کلچرل اکادمی) بھی ایک اور کوارٹر میں رہتے تھے، شاید 10 سی میں، اس لئے ہم دونوں ، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم تینوں اکثر ملتے رہتے تھے، آنجہانی عابد مناوری حکیم صاحب کے ہاں بلاناغہ آتے تھے، اس لئے اُن سے ہر دوسرے تیسرے روز ملاقات ہو جاتی تھی، ان ملاقاتوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عابد مناوری کے پتاجی نے گاندھی نگر کے آس پاس ہی مکان بنالیا تھا، اس لئے عابد کو یہ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی، عابد مناوری ویسے بھی دلچسپ انسان تھے بلکہ ایک پُر خلوص دوست بھی تھے۔

عابد مناوری کا اصل نام گوری نندن بالی تھا، اُن کا آبائی وطن مناور تھا لیکن تقسیم وطن کے بعد اُن کا خاندان جموں میں رہنے لگا تھا۔ اُس زمانے میں مناور میرپور کے علاقے میں پڑتا تھا۔ گوری نندن 27 مئی 1938ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے پتاجی کا نام رائے زادہ برکت رائے بالی تھا، وہ ایک سلجھے ہوئے، باذوق اور پُر خلوص انسان تھے۔ عابد مناوری کے دوستوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُنہیں علم و ادب میں بھی دلچسپی تھی۔

عابد مناوری کا پہلا مجموعہ کلام ''بہارِ غزل'' جون 1961ء میں شائع ہوا، یہ شعری مجموعہ اُنہوں نے عرش صہبائی کے نام منسوب کیا ہے، اس کا مختصر سا پیش

لفظ جوش ملسیانی نے تحریر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ''عابد صاحب میرے ہی عزیز اور میرے ہی دامنِ ادب سے وابستہ ہیں، اُن کی حسن طبیعت اور ذوق شاعری کا مداح ہوں، چھوٹی سی بحروں میں اُن کی شگفتہ بیانی ہر شعر کو شاخِ گل بنا دیتی ہے۔

وہ بولے مجھے بزم میں دیکھ کر
کہاں سے یہ خانہ خراب آ گیا

حرفے چند کے عنوان سے تلوک چند محروم نے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ عابد مناوری کا کلام واقعی جاندار اور موثر ہے۔

لذت انتظار کیا شئے ہے
یہ کس بے قرار سے پوچھوں؟!

علی جواد زیدی عابد مناوری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ادبی فضا میں عابد نے اپنے لئے ایک جگہ بنالی ہے شفا گوالیاری کی نظر میں عابد صاحب محنت سے شعر کہتے ہیں اور مشوروں اور اصلاحوں کو شعور و دل سے جذب کر لیتے ہیں۔

یوں کرنے کو وہ کیا نہیں کرتے
ایک ہم سے وفا نہیں کرتے

بہارِ غزل کے بعد اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''شمیمِ گل'' ہے، یہ مجموعہ کلام 1963ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے حکیم منظور اور عرش صہبائی نے ترتیب دیا تھا۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے، وہ اُن دنوں جموں یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔

پروفیسر ظہور الدین عابد مناوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عابد ایک بیدار مغز شاعر تھے، دنیائے ادب میں نمودار ہونے والی تبدیلیوں کا انہیں پورا پورا شعور تھا، انہوں نے ذہن و دل کے دروازوں کو ہمیشہ کھلا رکھا تھا۔

اُن سے الفت سی ہو چلی ہے　　　　زندگی رُخ بدل رہی ہے

ریاست کے معروف شاعر مظفر ایرج ، عابد مناوری کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''عابد مناوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، اگر چہ انہوں نے نظمیں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ لکھیں اور پیارے پیارے گیت بھی تخلیق کئے اور اُن میں جو زبان استعمال کی وہ ہندی آمیز تھی اور لچکدار بھی۔

کھیت بنجر، پیڑ ننگے سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکے ہو گئے گاؤں کے کچے راستے

عابد مناوری کا ایک اور شعری مجموعے کا نام ''برجستہ'' ہے۔ یہ 1984ء میں شائع ہوا تھا، اس میں 1971ء سے لے کر 1982ء تک اُن کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ اُنہوں نے حکیم منظور کی نذر کیا ہے۔ عابد مناوری کی شعر و شاعری کے اعتبار سے یہ بات کتنی اہم ہے کہ انہیں جوش ملسیانی جیسے قادر الکلام شاعر کی شاگردی نصیب ہوئی۔ عرش صہبائی کے مشوروں کو اپنایا، حکیم منظور کی دوستی اور قربت سے اُن کی شاعرانہ طبیعت کے سارے تخلیقی جوہر اُجاگر ہوئے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے ''کشمیر میں اُردو'' میں عابد مناوری کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے...... اور بقول پریمی رومانی عابد مناوری ایک حقیقی شاعر تھے، ان کی شاعری میں قوس وقزح کی طرح بے شمار رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

19 ستمبر 1995ء کو عابد مناوری اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن ادبی حلقوں میں آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک جھونکا بجھا گیا مجھ کو

٭٭٭

10

جہاں اقبال وہاں آزاد

میرے سامنے محمد فاروق فارسٹر تھنہ ملیگام (بانہال) کا ایک خط ہے جو انہوں نے مجھے 9/نومبر 2001ء کو لکھا تھا اور اس خط میں انہوں نے اُردو ادب کے ممتاز شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے فکر و فن پر ایک کتاب ترتیب دینے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان دنوں آزاد صاحب بقید حیات تھے اور انہوں نے فاروق صاحب کو کتاب ترتیب دینے کی اجازت بھی دی تھی۔ 9/نومبر 2007ء کو ملک بھر میں یوم اقبال منایا گیا، کشمیر میں بھی بہت سی تقاریب کا انعقاد کیا گیا۔ کشمیر یونیورسٹی، گریٹر کشمیر فاؤنڈیشن، اُردو اکادمی جموں و کشمیر اور محکمہ تعلیم نے کشمیر میں ہفتہ اقبال منانے میں اہم رول ادا کیا۔ بہرحال فاروق صاحب کی یہ کتاب شائع ہوئی کہ نہیں مجھے اس کی کوئی جانکاری نہیں لیکن یومِ اقبال کی مناسبت سے مجھے فاروق صاحب کے خط کی یاد آئی۔

جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی جگن ناتھ آزاد کی بات ہوتی ہے تو علامہ اقبال کا چہرہ نظروں کے سامنے خود بخود اُبھرتا ہے۔ یہ آزاد صاحب کی اقبال شناسی کا ایک ثبوت ہے، آزاد صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہیں کہ معاصرین نے ان کی اقبال شناسی کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ آج آزاد صاحب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی اقبال دوستی زندہ ہے اور قائم ہے۔

آزاد صاحب کو ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مقبولیت حاصل تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے باشندے تھے اور ہمیشہ ہی دونوں ملکوں کی ترقی اور خوشحالی کے خواہاں تھے۔ 14/اگست 1947ء کی رات کو قیام پاکستان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان سے جو ترانہ ''اے سرزمین پاک......'' نشر ہوا، وہ آزاد صاحب کا لکھا ہوا تھا۔

خلیق انجم لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں علامہ اقبال کا نام لینا جرم تھا کیونکہ فرقہ پرستوں نے غلط حقائق کی بنیاد پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ علامہ ملک کی تقسیم کے ذمہ دار تھے۔ لیکن اس زمانے میں آزاد نے ایک طویل مضمون لکھ کر ان کی عظمت کو اُبھارا۔''

ڈاکٹر اقبال پر پروفیسر آزاد نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ علامہ اقبال پر لکھے گئے ان کے مضامین ان گنت ہیں۔

جگن ناتھ آزاد معروف ادبی شخصیت پروفیسر تلوک چند محروم کے فرزند تھے لہٰذا بچپن سے ہی انہیں علمی اور ادبی ماحول نصیب ہوا اور پھر اپنی شعوری کوششوں سے وہ منزل حاصل کی جو ہر ادیب، شاعر، یا نقاد کو چاہتے ہوئے بھی نہیں ملتی۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''جگن ناتھ آزاد نہ صرف شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، انہوں نے شعر و سخن کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ اقبال ابتداء سے ہی ان کا محبوب شاعر رہا ہے۔''

پروفیسر اسد اللہ وانی کے ایک سوال ''اقبال کے علاوہ آپ کس شاعر سے متاثر ہیں'' کے جواب میں آزاد نے کہا تھا:

''کوئی بھی شاعر یا فنکار اپنی زندگی میں صرف ایک یا دو شاعروں سے متاثر نہیں ہوتا، وہ بیک وقت کئی شعراء سے متاثر ہوتا ہے جیسے ایک پودا صرف زمین سے اپنی خوراک حاصل نہیں کرتا بلکہ فضاء سے بھی حاصل کر لیتا ہے، سورج کی کرنوں اور بارش سے بھی لیکن یہ صحیح ہے کہ میں اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔''

ماہنامہ شاعر (نومبر 1950) میں علامہ سیماب اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''آزاد ایک فطری شاعر ہیں، مشاقی اور پختگی ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے، ان کا سیاسی شعور بھی گہرا ہے، طبیعت

میں خلوص اور حق گوئی اس درجہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا بڑی بے
باکی سے اظہار کرتے ہیں، ان کے یہاں آرزومندی کے ساتھ
ساتھ حوصلہ مندی بھی پائی جاتی ہے۔''

''اقبال اور اس کا عہد''......جگن ناتھ آزاد کی یہ تصنیف 1977ء میں پاکستان میں شائع ہوئی، اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آنجہانی آزاد کو اقبالیات پر کس قدر گہری نظر تھی۔

27 ر اکتوبر 1973ء کو آزاد صاحب کی ان تھک کوششوں کے بعد سرینگر میں اقبال نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کو کامیاب بنانے کے لئے کشمیر یونیورسٹی نے ایک اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر شکیل الرحمان یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے سربراہ تھے اور محمد یوسف ٹینگ کلچرل اکادمی کے سیکریٹری۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں ٹینگ صاحب نے فرمایا:

''اقبال کے آبا و اجداد کشمیری تھے اور ایک تاریخی واقعہ ہے اور ہمارے
لئے باعث مسرت لیکن اقبال نے اپنے فکر و فن کے چراغ جلا کر انسانیت
کے لئے احساس جمال اور اس کی بصیرت کے افق میں جو وسعت اور
گیرائی پیدا کی اس کے لئے ساری دنیا ان کی احسان مند ہے۔

ٹھہر نہ سکا کسی خانقاہ میں اقبال
کہ تھا ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

جب ہم آنجہانی جگن ناتھ آزاد کی بات کرتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہیں یا ان کا نام لیتے ہیں تو علامہ اقبالؒ کا ذکر کئے بغیر آزاد صاحب کی شخصیت ادھوری سی لگتی ہے۔ اس لئے جہاں اقبال ہے وہاں آزاد ہے اور جہاں آزاد ہے وہاں اقبال ہے۔ بقول وزیر آغا بابر:

''آزاد کے خون میں اقبال کی شخصیت گردش کرتی رہتی ہے۔''

❀❀❀

11

خوش خمیری، شوخ فکری، شیر دل

پروفیسر محی الدّین حاجنی

پروفیسر محی الدین حاجنی ضلع بارہمولہ کے حاجن نامی گاؤں میں 22 جون 1917ء کو پیدا ہوئے ، وہ صرف تین برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ اس لئے حاجنی صاحب کی پرورش ان کے چاچا غلام رسول پرے نے کی۔ حاجنی صاحب کا تعلق یا یوں کہیے ان کی پیدائش ایک علمی اور ادبی گھرانے میں ہوئی۔ یہ عالم ، فاضل ، ادیب ، شاعر اور قلم کاروں کا گھرانہ تھا۔ مرحوم وہاب پرے جو کشمیر میں ایک اعلیٰ اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، حاجنی صاحب کے دادا تھے۔ حاجنی صاحب کی تعلیمی تفصیلات یوں ہیں:

پرائمری...... حاجن سکول

میٹرک 1932ء...... پنجاب یونیورسٹی

بی اے 1936ء...... ایس پی کالج سرینگر

ڈپلوما کورس ان جرنلزم، ایم۔ اے۔ ایل ایل بی 1939ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سرینگر میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن اس پیشے میں ان کا دل نہ لگا۔ ان کی 1940ء میں پرنس آف ویلز کالج جموں میں بحیثیت عربک لیکچرار تعیناتی ہوئی اور 1946ء تک یہاں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد حاجنی صاحب کو ایس پی کالج سرینگر تبدیل کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ جموں تبدیل کیا گیا اور پھر وہاں سے سرینگر آئے۔ ایس پی کالج سرینگر سے ہی سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔

کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد حاجنی صاحب 1993ء میں 16ر جنوری کو انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال سے کشمیری زبان وادب میں جو خلاء پیدا ہوا وہ آج تک پُر نہ ہو سکا اور نہ شاید کبھی ہوگا۔

حاجنی صاحب کی اہم تصنیفات میں کاشر نثر چ کتاب، ''گریس سندگر'' اور'' ٹکہ رس'' شامل ہیں۔ حاجنی صاحب نے مسدس حالی کا کشمیری میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ 1962ء کی بات ہے حالانکہ اس کی شروعات وہ 1940ء میں کر چکے تھے۔ سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ حاجنی صاحب کا یہ ترجمہ اسی بحر میں ہے۔ جس میں حالی مرحوم کی یہ تخلیق ہے۔ حاجنی صاحب کی مرتب کی گئی کتابوں میں دیوانِ وہاب پرے، کلیات اسد پرے، کلیات مولوی صدیق اللہ اور کاشر شاعری شامل ہیں۔ ان کا ایک کتابچہ ''گامو منزی پھیری پھیری'' (گاؤں میں گھومتے گھومتے ہوئے) بھی ایک ادبی کارنامہ ہے۔ 1967ء میں ان کی ایک تصنیف ''مقالات'' شائع ہوئی جس پر انہیں ساہتیہ اکاڈمی کے انعام سے نوازا گیا۔ حاجنی صاحب کو عربی زبان کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ وہ مغربی علوم اور ادب پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

پروفیسر رحمان راہی، پروفیسر حاجنی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

علم، عرفان، سادہ سامان زندگی

خوش خمیری، شوخ فکری، شیر دل

میٹھے مقصد کی خاطر کڑوا سچ، دانشمند دیوانگی

چشمہ ظلمات......محی الدین حاجنی

یوں تو حاجنی صاحب سادہ اور پروقار شخصیت لگتے تھے لیکن جب کبھی ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی تو ہر طرف قہقہے سنائی دیتے۔ بقول پروفیسر محمد زماں آزردہ:

''حاجنی صاحب میں جہاں علمی سنجیدگی اور ذہانت کوٹ کوٹ کے بھری تھی، وہاں ظرافت بھی ان کی خاص خصوصیت تھی۔''

حاجنی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ درویش صفت انسان چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔

حاجنی صاحب کی وفات کے بعد کلچرل اکادمی نے کشمیری زبان میں شیرازہ کا حاجنی نمبر 1993ء میں شائع کیا۔ حاجنی صاحب کی زندگی، انکی نثری اور شعری تخلیقات اور ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے تعلق سے یہ نمبر بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس نمبر میں ریاست کے بلند قامت قلم کاروں نے حصہ لیا ہے۔ نشاط انصاری صاحب اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''حاجنی صاحب کو تمام عالم اسلام میں فکری بیداری دیکھنے کی آرزو تھی اور وہ اس سلسلے میں سیاسی سرحدوں کے قائل نہ تھے بلکہ بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ وہ اس کے ساتھ ہی کشمیری قوم کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور فکری نشاۃ الثانیہ کے لئے بھی کوشاں تھے اور ان کے لئے انہوں نے اپنے کئی مقالات میں کشمیری ذہن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔''

حاجنی صاحب کو اپنی زندگی میں دوبار جیل بھی جانا پڑا۔ پہلی بار 1949ء میں اور دوسری بار 1965ء میں بقول مرحوم میر غلام رسول نازکی:

''حاجنی صاحب کا ایک رقیب تھا عبدالخالق پرنگ، وہ بخشی صاحب کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، اور جیل بھی ان کی وجہ سے جانا پڑا۔ جب تک پرنگ صاحب حیات تھے۔ یہ رقابت قائم رہی۔''

نازکی صاحب مزید لکھتے ہیں:

'' حاجنی صاحب کا ایک پسندیدہ موضوع شہر اور دیہات تھے۔ وہ شہری عوام کو ''فرش'' پر اور دیہی عوام کو ''عرش'' پر دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کی کمزوری تھی یا نظریہ ...... اس کی کبھی انہوں نے وضاحت نہ کی۔''

حاجنی صاحب شروع میں محی الدین محی کے نام سے لکھتے ہیں، وہ خود فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس زمانے میں لکھنا شروع کیا جب وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے لیکن ان کا پہلا کشمیری زبان میں تحریر کردہ مضمون ''آوازِ اخوت'' 1937ء میں ایس پی کالج کے پرتاب میگزین میں شائع ہوا۔

حاجنی صاحب اپنی شکل وصورت سے بے حد سادہ نظر آتے تھے لیکن ان کے قلم کی شکتی، ان کی تخلیقات اور سب سے بڑھ کر کشمیر اور کشمیری زبان سے ان کی محبت کشمیر کی تاریخ میں زندہ اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ وہ کشمیریت اور کشمیری زبان کی ایک علامت تھے

علمہ ادبک بادشاہ
پوز کا شریک غمخاراوس
راتھ دوہ اتھ گوڈ برانی
زن تمس یتے یوت کاراوس!!!

❁❁❁

12

میرا لہجہ ہے میری ادا

میکش کاشمیری کا نام ذہن میں اُبھرتے ہی میری نظروں کے سامنے ایک اور شخصیت کے خدوخال گھوم جاتے ہیں۔ یہ منوہر لال دل ہیں۔ وہ محکمہ تعلیم میں ٹائپسٹ تھے اور جب ٹائپ کرتے سمے ٹک ٹک کی آواز گونجتی تھی تو کبھی کبھار دل صاحب کے دل کی آواز بھی باہر آجاتی اور شعر میں ڈھل جاتی تھی۔ میں جب ان سے ملا تو وہ عمر کے لحاظ سے ''بزرگ'' ہو چکے تھے اور رٹائرمنٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی مشاعروں میں بھی ضرور نظر آتے تھے اور داد بھی ملتی تھی لیکن نہ ان کی زندگی میں اور نہ ہی ان کے دیہانت کے بعد ان کا کوئی بھی شعری مجموعہ شائع ہوا۔ بدقسمتی سے پچھلی چار دہائیوں سے میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا۔ وہ اب ماضی کی ایک داستان بن کر رہ گئے ہیں البتہ ان کی غزل کے چند اشعار قلم بند کر رہا ہوں، ان کی یہ غزل ماہنامہ سنگم جموں میں مارچ 1961ء میں شائع ہوئی تھی۔

زندگی غم سے ہراساں کبھی ایسی تو نہ تھی
عافیت خواب ہراساں کبھی ایسی تو نہ تھی

کون آیا ہے گیا کون اداسی کیوں ہے
صورت منزل جاناں کبھی ایسی تو نہ تھی

منوہر لال دل کے یوں تو کافی دوست تھے لیکن موہن یاور اور میکش کاشمیری کے وہ زیادہ قریب تھے۔

کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری اصلاً نسلاً کشمیری تھے۔ وہ 17 رجولائی 1916ء میں ہفت چنار سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت جیون ناتھ کول

محکمہ ابریشم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن جب ان کی تبدیلی جموں ہوگئی تو وہ جموں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ میکش کاشمیری کشمیری کے ساتھ ساتھ ڈوگری بھی بڑی روانی کے ساتھ بولتے تھے، میکش نے میٹرک کا امتحان جموں میں ہی پاس کیا اور بعد میں کالج کی تعلیم بھی جموں میں ہی حاصل کی۔

جب جموں میں ریڈیو سٹیشن قائم ہوا تو میکش بحیثیت اسکرپٹ رائٹر یہاں ملازم ہوئے اور اپنی رٹائرمنٹ تک ریڈیو سے ہی منسلک رہے۔ اپنی ملازمت کے دوران کچھ وقت کے لئے ریڈیو کشمیر سرینگر سے بھی وابستہ رہے۔ ریڈیو جموں میں انہوں نے پہلی بار ''پمپوش'' کے نام سے کشمیری زبان میں ایک علمی اور ادبی سرگرمی شروع کی۔ اس کے علاوہ میکش صاحب ''کہکشاں'' کے نام سے اُردو زبان میں ایک ادبی پروگرام پیش کرتے رہے جو کافی مقبول ہوا۔ ''محفل'' کے نام سے ایک اور پروگرام ترتیب دیتے رہے۔

میکش کاشمیری اپنے دور کے بیدار مغز اور انسان دوست شخص تھے۔ انہیں کتب بینی کا بے حد شوق تھا اور علامہ اقبال ان کے محبوب شاعر تھے۔ میکش کاشمیری نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی کثرت سے لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی ادبی تیز رفتاری میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا اور کچھ وقت کے لئے شعر وشاعری سے دور ہو گئے لیکن پھر ''بال ہما'' کے ساتھ سامنے آ گئے۔ میکش کاشمیری علامہ اقبال کے قریب تو تھے ہی لیکن انہوں نے اپنی شاعری میں دوسرے استاد شعراء کا بھی اثر قبول کیا ہے جیسے غالب کی زمین میں کہی ہوئی میکش کاشمیری کا یہ شعر

جب سنا ان سے سنا کرے کوئی　　کیا بیاں مدعا کرے کوئی

ڈاکٹر پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''میکش نے صرف کشمیر کو ہی اپنی نظموں کا موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ عام موضوعات پر بڑی دلآویز نظمیں لکھی ہیں، وہ مدر ٹریسا کی سماجی خدمات سے بے حد متاثر تھے

مدر بے شک نحیف وزار لوگوں کی مسیحا تھی
پریشان حال، دل فگار لوگوں کی مسیحا تھی

میکش کاشمیری نے غزل گوئی میں بھی اپنے جوہر دکھائے، وہ قطعات اور رباعیات بھی لکھتے تھے۔ 1999ء میں میکش کاشمیری کا دوسرا شاعری مجموعہ ''بال عنقا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں شائع غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ میکش کو شاعری کے رموز سے پوری جانکاری تھی۔

سید خورشید کاظمی کی نظر میں میکش کاشمیری ایک ایسے منفرد شاعر تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے ملکی سطح پر ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگرچہ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، ہر محفل میں ان کا موجودگی لازمی تھی، ہر مشاعرہ میں وہ نظر آتے تھے۔

''شہپر طاؤس'' ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ عرش صہبائی ریڈیو میں ان کے ساتھی تھے عرش صہبائی لکھتے ہیں کہ اگرچہ رٹائرمنٹ کے بعد میکش کاشمیری نے بدری ناتھ سکول میں بحیثیت انگریزی استاد کام کرنا شروع کیا تھا لیکن ریڈیو سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے ریڈیو کے کسی بھی پروگرام میں حصہ نہیں لیا۔

میکش کاشمیری نے روایتی شاعری کو ہی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ وہ غزل کے دلدادہ تھے، ان کے کلام میں روانی ہے، شیرنی اور مٹھاس ہے، تازگی اور نغمگی بھی۔ اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میرے کلام میں نیا رنگ و آہنگ قطعی نہیں کیونکہ میں جدیدیت کا قائل نہیں اور صرف کلاسیکی قدروں کا پرستار ہوں، جب میں نے شاعر مشرق و دانائے راز علامہ اقبال کے کلام کا عمیق مطالعہ کیا اور اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی تو مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا اور عرفان بھی کہ شاعری جزویست از پیغمبری!!!''

پنڈت کیلاش ناتھ میکش کاشمیری 19 رجنوری 2006ء کو ممبئی میں انتقال کر گئے وہ وہاں اپنے بیٹے کرنل سنجیو کول کے پاس رہ رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا ایک اور مجموعہ کلام ''ساز رگ جاں'' ترتیب دیا جا رہا تھا!!!

❁❁❁

13

وطن سے جلا وطنی تک

پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ سرکاری، غیر سرکاری اور ادبی حلقوں میں پی۔ این۔ پشپ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ پرتھوی ناتھ کا نام سنتے یا پڑھتے وقت ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے لیکن پی این پشپ سنتے یا پڑھتے ہی ان کی صورت نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ ان کے مسکراتے ہونٹوں کی وجہ سے ان کا چہرہ کھلا کھلا سا لگتا تھا۔ یہ مسکراہٹ ان کے سنجیدہ ہونے پر بھی ظاہر ہوتی تھی۔ ان کا رنگ گورا سا تھا، گلہ بند کوٹ اور پینٹ ان کا محبوب لباس تھا۔

پشپ صاحب 16 / اکتوبر 1917ء کو پیدا ہوئے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1940ء میں ان کی تعیناتی بحیثیت لیکچرار کے ہوئی۔ سرکاری ملازمت کے دوران بہت سارے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد آخر کار بحیثیت ڈائریکٹر لائبریریز اینڈ میوزیم سبکدوش ہوگئے۔ 10 / اکتوبر 1996ء کو اپنی حیات کے 80 برس پورے کرنے کے موقع پر کشمیر کلچرل اور سائنس سوسائٹی نے دہلی میں ان کی عزت افزائی کے لئے ایک یادگاری تحفہ پیش کرنے کی پوری تیاری مکمل کر لی تھیں کہ وہ دن آنے سے پہلے ہی پشپ صاحب کی روح 19 / ستمبر 1996ء کو اس دنیا سے بہت دور دوسری دنیا میں چلی گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ہے اور اس فانی دنیا میں رہ جاتی ہیں جانے والے کی یادیں ...... ان گنت یادیں!!!

اور بقول کپل واتسائین:

> ''پشپ صاحب ایک منجھے ہوئے سکالر تھے ان کا شہرہ ملک اور ملک سے باہر امریکہ اور برطانیہ میں بھی تھا، جلسوں اور ادبی محفلوں، مباحثوں اور علمی نشستوں میں ان کی بات کو توجہ سے سنا جاتا تھا، ان کی بات میں ایک وزن، ایک وقار ہوتا تھا۔

سرینگر میں گوگجی باغ میں رہتے تھے، ان کا اپنا گھر تھا، گرہستی تھی لیکن بعد میں کشمیر کے حالات کے پسِ منظر میں اپنا گھر اپنا وطن چھوڑ کر دلی آ گئے تھے اور بقول آنجہانی موتی لال ساقی:

> ''کشمیر سے جانے کے بعد پشپ صاحب کے چہرے کی بشاشت ہوا ہوگئی تھی، ان کے ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ حزن و ملال کی دبیز تہہ کے نیچے دب گئی تھی۔ وہ تو بھرم رکھنے کی کوشش ضرور کرتے تھے لیکن جلاوطنی کی جلن سے وہ اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ وطن سے جدائی کے کرب نے جو اتھل پتھل ان کے اندر پیدا کی تھی اس کا عکس ان کے چہرے پر بھی نمایاں تھا۔''

دہلی جا کر وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ کمر درد کی وجہ سے وہ سیڑھیاں بھی مشکل سے چڑھ سکتے تھے۔

پشپ صاحب کشمیری ڈکشنری کے علاوہ کاشر انسائیکلوپیڈیا سے بھی وابستہ رہے، کشمیری ڈکشنری کے ممبران وقت بے وقت بدل دیئے جاتے تھے لیکن پشپ صاحب شروع سے آخر تک جمے رہے اور کام کرتے رہے۔

پشپ صاحب کے قلم میں بڑی شکتی تھی، کشمیری کے علاوہ انگریزی، اُردو اور ہندی میں بھی لکھتے تھے، وہ فارسی اور سنسکرت جیسی کلاسیکی زبانوں کے بھی عالم تھے، وہ ڈوگری اور پنجابی کے علاوہ بنگالی زبان کو بھی سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے گوجری سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔ پشپ صاحب کو شعر و شاعری کے ساتھ بھی کافی شغف تھا، خود بھی لکھتے تھے اور دوسروں کے کلام کو بھی سنتے تھے اور اکثر گنگناتے تھے۔

پشپ صاحب کی شخصیت کا ایک اور بڑا پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ البتہ اگر کسی علمی یا ادبی دوست کی بات سے اتفاق نہیں ہوتا تو وہ ہنستے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ناشائستگی سے وہ ناواقف تھے، بحث و مباحثہ کے دوران نہ تو آپے سے باہر ہو جاتے اور نہ ہی دب کر رہ جاتے۔

اپنی بات کو ایک عالم، ایک مفکر کی طرح دوسروں تک پہنچاتے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک روشن پہلو تھا۔

کہا جاتا ہے کہ پشپ صاحب اور عارف صاحب نے مل کر آئین ہند کا کشمیری ترجمہ کیا تھا لیکن یہ کہاں اور کس حالت میں ہے اس کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں۔

پشپ صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سرینگر ان کا من پسند شہر تھا اور وہ اپنا اکثر وقت سرینگر میں ہی گذاتے تھے یہاں تک کہ سرینگر سے باہر ہونے والی تقریبات میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ مقامی طور پر وہ بہت کم انجمنوں اور تنظیموں سے وابستہ رہے لیکن 1991ء سے 1996ء تک آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری رہے۔ پشپ صاحب ساہتیہ اکادمی کی مشاوراتی کمیٹی کے بھی کچھ عرصہ ممبر رہے، مرکزی سنسکرت بورڈ اور لسانی کمیشن سے بھی ان کا گہرا واسطہ رہا۔ ریاستی کلچرل اکادمی کی ہندی مشاورتی کمیٹی کے اہم اور سرگرم ممبر بھی رہے۔ پشپ صاحب کو لکھنے پڑھنے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ گھر اور دفتر کے علاوہ وہ اگر کہیں نظر آتے تھے تو وہ کشمیر بک شاپ تھا۔ کشمیر بک شاپ کے مالک اندر جیت سنگھ بذاتِ خود ایک نہایت دلچسپ اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے، اگرچہ وہ امرتسر کے رہنے والے تھے لیکن وہ کشمیر کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں ان کی دوستی کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ اسی دوستی کے پس منظر میں پشپ صاحب کشمیر بک شاپ ریذیڈنسی روڈ سرینگر میں کرسی سنبھالے کتابوں میں غرق ہو جاتے تھے۔

میں جب بھی پشپ صاحب سے ملا وہ اپنی مسکراہٹ لئے ہمیشہ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آئے!!!

❁❁❁

14

دُنیا میری جوان ہے

ملکہ ترنم نور جہاں کے نام سے کون واقف نہ ہوگا، اس کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ اپنے دور کی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ بحیثیت اداکارہ وہ بے حد مقبول اور مشہور تھی، بحیثیت گلوکارہ وہ سر فہرست تھی، اس کی آواز میں جہاں آگ کی تپش تھی وہیں شبنم کی پھوار بھی تھی۔ وہ اپنے حلقہ احباب میں میڈم کے نام سے جانی جاتی تھی!

مجھے حال ہی میں ڈاکٹر عالیہ عنوان کی وساطت سے میڈم پر تحریر کردہ ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ مضمون پاکستان کے ایک قلمکار ضیاء ساجد نے 1986ء میں تحریر کیا ہے۔ ان دنوں میڈم نور جہاں حیات تھیں۔ دراصل یہ مضمون ان کی کتاب ''فلمی محبتیں'' میں شامل ہے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب فلموں سے وابستہ افراد کی ''محبتوں'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ملکہ ترنم نور جہاں کی زندگی میں بھی ''رومانس'' کا بہت دخل رہا ہے۔ اس کی جادوئی شخصیت کے دامن میں کتنے ہی بھنورے منڈلاتے رہے ہیں۔

وہ جب اپنے والدین کے ساتھ پہلی بار ممبئی آئی تو اس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ اونچ نیچ کا زیادہ شعور نہ تھا۔ فلمی دنیا میں اس کا سواگت ہوا اور ممبئی کی فلمی دنیا میں جو پہلا شخص اس کی زندگی میں آیا وہ شوکت حسین رضوی تھا۔ نور جہاں کے والدین اس دوستی یا اس قربت سے ناخوش تھے۔ انہیں شاید اپنے خواب مٹتے نظر آرہے تھے لیکن نور جہاں رضوی صاحب سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھی۔ کچھ عرصہ کے لئے یہ شادی اس وجہ سے رک گئی تا کہ فلم انڈسٹری میں وہ اپنے

پاؤں مضبوطی سے جما سکے۔ والدین کے لئے کچھ کما سکے لیکن ان دونوں کے درمیان دوری کا یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا اور ان کی آپسی محبت شادی میں بدل گئی۔ وہ خود کہتی ہیں:

''شادی سے میرے دل کی مراد بھر آئی اور میں شوکت کے پیار میں غرق ہوگئی۔''

کچھ عرصہ بعد شوکت حسین رضوی نے فلم ''جگنو'' بنانے کا اعلان کیا، اس میں نور جہاں کو ہیروئن اور دلیپ کمار کو ہیرو کا رول دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ''جگنو'' کی شوٹنگ کے دوران دلیپ کمار، نور جہاں میں دلچسپی لینے لگا لیکن نور جہاں نے دلیپ صاحب کی دلچسپی میں اپنی کوئی دلچسپی ظاہر نہ ہونے دی، شاید اس وجہ سے کہ فلم پر کوئی اثر نہ پڑے اور ایک روز جب بات ذرا بڑھی تو نور جہاں دلیپ کمار سے الجھ گئی۔ اس بات پر رضوی صاحب نور جہاں سے خفا ہو گئے اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے فلم شوٹنگ کے دوران کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں بلکہ کام سے کام رکھنا چاہیے۔ آہستہ آہستہ ان کی دوریاں بڑھنے لگیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد وہ دونوں اپنے بچوں سمیت پاکستان آ گئے اور یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ پاکستان آ کر نور جہاں نے اپنی ساری کمائی رضوی کے حوالے کر دی اور شوکت حسین رضوی نے اس کمائی سے شاہ نور سٹیڈیو کی بنیاد ڈالی۔ نور جہاں نے پاکستانی فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ دوسروں کے لئے اپنی آواز بھی دی۔ پاکستانی فلم ''چن وے'' میں اس نے جہانگیر کے مدمقابل کام کیا، فلم بے حد کامیاب تو ہوئی لیکن رضوی اور میڈم کے درمیان جہانگیر آ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد فلم ''دوپٹہ'' بنی، وہ بھی خوب چلی۔ دوپٹہ کے بعد نور جہاں کو امتیاز علی تاج نے فلم ''گلزار'' کے لئے سائن کیا۔ ابھی فلم بن ہی رہی تھی کہ شوکت حسین رضوی نے نور جہاں کو فلم ایکٹر سنتوش کمار میں دلچسپی لینے کا الزام لگایا اور بقول نور جہاں:

''یوں تو ہم ایک دوسرے سے جڑے رہے لیکن ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے۔''

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد میڈم کی زندگی میں اپنے زمانے کے معروف کرکٹ کھلاڑی نذر محمد آ گیا۔ اچھا کرکٹ کھیلنے کی وجہ سے نور جہاں اس کی فین بن چکی تھی اور وہ نور جہاں کے فن سے متاثر تھا۔ وہ دونوں دوست کی طرح کافی دیر تک ملتے رہے، اب شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کے بچے نوجوان ہونے لگے تھے لیکن ان کی دوریاں کم نہ ہو سکیں اور ایک دن ان دونوں کے درمیان طلاق ہو گئی۔

اور پھر نور جہاں کی زندگی میں پاکستانی فلمون کا ایک غیر معروف ایکٹر اعجاز آ گیا۔ نور جہاں سے شادی کرتے ہی وہ فلمی دنیا کا ایک نام بن گیا، اسے دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں، اس نے بہت سارا پیسہ کمایا، میڈم بھی خوب کمائی کر رہی تھی۔ دونوں نے مل کر پنجاب پکچرز کے نام سے اپنا فلم ساز ارادہ بنایا۔

نور جہاں کے بطن سے اعجاز کی تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، اس طرح وہ چھ بچوں کی ماں بن گئی۔ ان میں سے تین شوکت کے تھے دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ اسی دوران اعجاز کی زندگی میں فردوس نامی ایک عورت آ گئی اور اس نے نور جہاں کو طلاق دے دی۔

کہا جاتا ہے کہ اس طلاق کی وجہ سے نور جہاں اعصابی طور پر بیمار رہنے لگی۔ مزاج میں بھی چڑچڑاپن آ گیا۔ وہ خود کو بوڑھی تصور کرنے لگی، اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے وہ ملک سے باہر چلی گئی لیکن جب لوٹ کر آئی تو وہ پرسکون تھی دوبارہ فلموں میں کام کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی یوسف خان اس کی زندگی میں آیا ،نور جہاں کی محبت کی خاطر اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ یوسف خان نے فلم سوہنی مہیوال بنائی ، خود فلم کا ہیرو بنا لیکن فلم ناکام ہوئی اور ناکامی کے ساتھ ہی یوسف خان نور جہاں کی زندگی سے دور چلا گیا حالانکہ سوہنی مہیوال سے پہلے دوستی اور ہیر رانجھا جیسی سپر ہٹ فلمیں بنا کر اس نے کافی دولت اکٹھا کر لی تھی۔ کہا جاتا

ہے کہ ان دونوں فلموں نے نور جہاں کے گائے ہوئے گانوں کی وجہ سے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا۔

یوسف خان کے جانے سے وہ ایک بار پھر زندگی کی دوڑ میں اکیلی رہ گئی اب وہ بہت تھک چکی تھی، عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی!!

اور یہ تھی مقبولیت، شہرت، شرافت، سخاوت اور امارت والی شخصیت نور جہاں کی زندگی میں آنے والے مردوں کی ایک مختصر سی کہانی۔

اب نور جہاں اس دنیا میں نہیں لیکن آج بھی سنگیت کی دنیا میں اس کا اپنا ایک نام ہے، اس نام کی اپنی اہمیت ہے، آج بھی اس کی آواز زندہ ہے، آج بھی سنگیت کی دنیا میں اس کی آواز جوان ہے ع

دنیا میری جوان ہے

✿✿✿

15

سیماب سے شہ زور تک

ماہنامہ شاعر (ممبئی) کے بانی علامہ سیماب اکبر آبادی (مرحوم) نے اپنے کسی صدارتی خطبے میں کہا تھا کہ جس شخص کی سیرت اچھی نہ ہو وہ اچھا شاعر کبھی نہیں بن سکتا۔ شاعر کے لئے انسانیت اور ہمدردی بہت مقدم اور ضروری ہے۔

حال ہی میں شاعر میں خلیل تنویر صاحب کا ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا ہے۔ عنوان ہے ''اُردو شاعری میں احسان فراموشی کی روایت''۔ اس مضمون میں انہوں نے سیماب اکبر آبادی کے چند شاگردوں کا نام لیا ہے۔ خلیل تنویر کو یہ شکایت ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی کھلے دل سے اس بات کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ کہ وہ علامہ سیماب کے شاگرد رہے ہیں، شاید خلیل تنویر صاحب اس بات سے ناآشنا ہیں کہ علامہ سیماب مرحوم کے ایک اہم شاگرد کا تعلق کشمیر سے تھا اور ان کے کشمیری شاگرد نے کھلے الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ علامہ سیماب کے شاگردوں میں سے تھے۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے یہ شاعر غلام قادر شہ زور کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ 1936ء میں مولانا محمد سید مسعودی نے شہ زور کشمیری کی غزل پڑھ کر انہیں مشورہ دیا کی وہ سیماب کی شاگردی کا شرف حاصل کریں۔ انہوں نے مولانا کے مشورے پر عمل کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> مولانا محمد سید مسعودی کا مشورہ میرے لئے ایک حکم تھا جس کی تکمیل میں نے فوراً کی اور جب حضرت سیماب کے دست مبارک کی اصلاح شدہ غزل دیکھی تو میرے تن بدن میں ایک لہر دوڑ گئی اور یک

بیک کسی نامعلوم طریقے سے وہ نامعلوم کی دوری ہو گئی جسے میں مدت
سے محسوس کر رہا تھا۔

اے شہ زور ہے سیماب کے فیضان کا صدقہ
ملا الہام میں حصہ میرے قلب غزل خواں کو

غلام قادر شہ زور 27 رفروری 1915ء کو چوٹہ بازار کنہ کدل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے بعد مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1936ء میں ایس پی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر سرکاری ملازمت میں آگئے اور بحیثیت فائنانشل ایڈوائزر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ وہ 19 رجون 1990ء کو انتقال کر گئے۔

شہ زور صاحب کو لڑکپن سے ہی شعر و شاعری میں دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء دسویں جماعت کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کی۔ ان کے والد نے خوب ساتھ دیا، وہ خود بھی شعر شناس تھے، کالج میں انہیں اور کھل کر نکھرنے کا موقع ملا، ان کا کلام کالج میگزین پرتاب میں شائع ہونے لگا۔ انہوں نے کچھ ڈرامے بھی لکھے لیکن بعد میں فن شاعری کی جانب پوری توجہ مرکوز کی۔ 1938ء میں انہیں علامہ سیماب نے فارغ الاصلاح قرار دیا۔ ریاست میں شائع ہونے والے اخبارات میں ان کا کلام چھپتا رہا پھر وہ ریاست سے باہر شائع ہونے والے جرائد میں چھپنے لگے۔ ان کی پہلی نظم "ظلم کے آنسو" شاعر میں ہی شائع ہوئی تھی، شاعر میں ہی شائع ہونے والی ایک غزل سے ۔

ازل سے ڈھونڈتا ہوں ان نگاہِ نشتر جان کو
کبھی جس نے سکھایا تھا تڑپنا قلبِ انسان کو

شہ زور کشمیری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ادبی انجمنوں سے دور رہتے تھے۔ وہ بالکل سیدھی سادی اور الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے۔ نماز روزہ کے پابند تھے۔ بے حد مذہب پرست تھے۔

شہ زور مرحوم نے علامہ اقبال کا مطالعہ بصیرت کے ساتھ کیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے افکار اور لب ولہجہ سے کافی متاثر تھے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

''شہ زور کے کلام میں اقبال کی روح بولتی ہے۔ اس سے انہیں
کشمیر کا اقبال کہا جاتا ہے۔''

شہ زور مرحوم کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ انہیں فارسی کے علاوہ عربی اور ہندی پر بھی دست گاہ حاصل تھی۔ اُردو سے تو خیران کا والہانہ لگاؤ اور وابستگی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی شعر و شاعری کے لئے کشمیری زبان کو بھی اپنایا تھا لیکن بعد میں اُردو کو ہی وسیلہ اظہار بنایا۔

برصغیر کے نامور شاعر اور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری کی رائے میں شہ زور مرحوم بلاشبہ ایک بالغ نظر قادرالکلام اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شہ زور نے جس زمانے میں شاعری شروع کی وہ ملک کی تاریخ کا ایک ہنگامہ پرور اور بحرانی دور تھا، سیاسی بے چینی اور انتشار عروج پر تھا۔ آزادی کا جذبہ دلوں میں شعلہ زن تھا، طبقاتی کشمکش نقطہ آخر کو چھو رہی تھی۔ شہ زور کسی ازم سے وابستہ ہوئے بغیر زندگی کے ہنگامہ سامانیوں میں شریک رہے۔ انہوں نے اقبال، جوش اور سیماب کے انداز میں نظمیں لکھیں، ان نظموں میں انقلاب کا ایک مفکرانہ تصور ملتا ہے۔

ابھی ظلمت اثر ہر خواب کی تعبیر ہے ساقی
پلا وہ جامِ جم جس میں چاند کی تنویر ہے ساقی

شہ زور صاحب غزل، نظم، قطعہ اور رباعی کے اصناف پر قدرت رکھتے تھے۔ لیکن نظم نگاری ان کی پسندیدہ صنف تھی۔

میکدے پر سکوت طاری تھا
میں نے ٹکرا دیئے ہیں پیمانے

جب غلام قادر مرحوم نے شاعری کا آغاز کیا تو اپنے لئے شہ زور کا تخلص اختیار کیا اور پھر یوں کہا۔

یہ نام اور بتوں کے کرم پر تیری نظر
غلام قادر شہ زور، واہ کیا کہنا

❀❀❀

16

جہانگیر کی موت

زیڈ سیمی کا تعلق جموں سے تھا۔ وہ کب پیدا ہوا اور کس روز انتقال کر گیا، بہت کوشش کے بعد بھی میں تفاصیل حاصل کر سکا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ جموں نو اسی سیمی کو بھول چکے ہیں۔ اس کے چہرے کے خدوخال ان کے ذہنوں سے اتر چکے ہیں۔ جموں میں اس کا سب سے قریبی دوست بلکہ اگر یہ کہا جائے بڑا بھائی تو وہ موہن یاور تھے۔ میں نے اور برادرم حسن ساہو نے انہیں اکثر جموں کی سڑکوں، گلیوں اور قہوہ خانوں میں ایک ساتھ دیکھا ہے۔ زیڈ سیمی بے تحاشا پینے والوں میں سے تھے۔ ان کے پینے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ جہاں ملی، جب بھی ملی، پی لی لیکن میں نے انہیں ہمیشہ ہوش میں ہی دیکھا۔ ایسی محفلوں میں موہن یاور صرف چائے یا کافی پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

زیڈ سیمی ایک شاعر بھی تھے۔ وہ ریڈیو یا ریڈیو سے باہر کے مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ ادبی دنیا میں وہ بحیثیت شاعر ہی جانے جاتے تھے بہت کم لکھتے تھے لیکن جو بھی لکھتے تھے سنجیدگی سے لکھتے تھے۔ ان کا کلام جرائد میں بھی شائع ہوتا تھا۔ لیکن یہ سارا کلام اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہے اور اس طرح زیڈ سیمی کی موت کے ساتھ ہی ان کی ساری شاعری بھی گرد و غبار کی نذر ہوگئی۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

میرے پاس زیڈ سیمی کی ایک کتاب ہے...... واحد تصنیف، نام ہے ''جہانگیر کی موت''۔ یہ ایک ڈرامہ ہے جو ریڈیو جموں سے 1961ء یا 1962ء میں نشر ہوا تھا۔ سیمی صاحب نے اس ڈرامہ کو نومبر 1962ء میں کتابی صورت میں

پیش کیا۔ اس کتاب کو انہوں نے کسی ''نسیم'' کے نام منسوب کیا ہے۔ لکھا ہے:

نسیم کے نام

جس نے میری ویران زندگی میں پھول کھلا دیئے!

36 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت پچاس نئے پیسے لکھا ہے۔ کتاب میں ایک اشتہار بھی موجود ہے جس میں مصنف کی دوسری کتابوں کے بارے میں تفصیل دی گئی ہے۔ ان کتابوں کی تعداد چھ ہے لیکن ان سب کے آگے ''زیر طبع'' لکھا ہے۔ ان میں سے ایک بھی کتاب شائع نہ ہو سکی۔ تفصیل یوں ہے:

فلمی سیڑھیاں...... (فلمی شخصیتوں کے خاکے)

فلم فتنلے...... (مزاحیہ)

شاعر کا مارا...... (مزاحیہ)

طلوع...... (غزلیات)

جھنکار...... (ریڈیائی ڈرامے) اور

موہن یاور کا فن اور شخصیت (مضمون)

زیڈ سیمی ریڈیو کی ایک معروف اور مقبول آواز تھی۔ ریڈیو جموں سے نشر ہونے والے اکثر ڈراموں میں ان کی آواز شامل ہوتی تھی۔ اپنی آواز کی بدولت وہ ہر کردار کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ میرے کئی ڈراموں میں جو ریڈیو جموں سے نشر ہوئے انہوں نے اپنی آواز دی تھی۔

جہانگیر کی موت کا پیش لفظ آنجہانی موہن یاور نے لکھا ہے۔ یہ تحریر 6 / دسمبر 1962ء کی ہے۔ موہن یاور لکھتے ہیں:

> ''زیڈ سیمی بہت کم لکھتا ہے۔ لیکن جب لکھتا ہے تو اس کا قلم چومنے کو جی کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زیڈ سیمی کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں کرتا، وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔ کاش وہ اپنے اندر کے زیڈ سیمی کو تلاش کرے اور اس کے ساتھ گہرا ناطہ جوڑے۔''

یہ تھے آنجہانی موہن یاور کے تاثرات زیڈ سیمی اور اس کی کتاب کے تعلق سے......

زیڈ سیمی کی واحد کتاب جہانگیر کی موت دراصل ایک ریڈیائی ڈرامہ ہے جو پہلے ریڈیو جموں سے نشر ہوا۔ جہانگیر کا رول خود زیڈ سیمی نے ادا کیا تھا۔ پھر اس ڈرامہ کو کتابی صورت دے دی گئی۔

اور یہ ہیں ڈرامہ جہانگیر کی موت کے آخر الفاظ:

''نور جہاں بڑی ذہین تھی۔ اس نے سوچا اگر جہانگیر کی موت کی خبر پھیل گئی تو ملک میں بغاوت کا اندیشہ ہے اس نے اپنے خاص معتمدوں سے مشورہ کیا اور طبیب کی رائے کے مطابق جہانگیر کا پیٹ چاک کر کے اس میں سے انتڑیں نکال کر یہاں دفنادی گئیں اور جہانگیر کو پالکی میں بٹھا کر لاہور لے جایا گیا جہاں جا کر دو ایک روز کے بعد جہانگیر کی موت کا اعلان کر دیا گیا......!!!

❁❁❁

17

یادِ ایام سے خرامِ صبا تک

تقسیم ملک یا آزادی سے پہلے بھی اُردو ایک اہم زبان تصور کی جاتی تھی، آزادی کے بعد بھی اس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا گیا، اُردو ہی وہ زبان ہے جسے تبادلہ خیالات کے لئے مشترک ہونے کا فخر حاصل ہے اور ریاست جموں وکشمیر کو یہ فخر اور امتیاز حاصل ہے کہ اپنے آئین کی رو سے یہاں کی سرکاری زبان قرار دی گئی اور اس طرح سے سرکاری سرپرستی کے ساتھ اُردو کو عوامی سطح پر مقبولیت حاصل رہی، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہاں اردو کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یا اس وقت کرنا پڑ رہا ہے، اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں کونسی رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں، اس پر تفصیل کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زبان کی مدد سے آج بھی ہم ریاست جموں وکشمیر کی تینوں اکائیوں کے ثقافتی رشتے کو برقرار رکھنے کا ایک اہم کام انجام دے رہے ہیں۔

تقسیم ملک سے پہلے بھی ریاست جموں وکشمیر کے غیر مسلم یا یوں کہیے کشمیری پنڈت قلمکاروں نے ادبی دنیا میں ایک اہم مقام بنالیا تھا۔ اس ضمن میں پنڈت پریم ناتھ پٹواری بھی اپنے دوسرے قلمکاروں کے ساتھ ادبی دنیا میں ایک چھوٹا موٹا مقام بنانے میں کامیاب ہوچکے تھے، حالانکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کی ادبی حس کو جگانے میں پنڈت پریم ناتھ پردیسی اور پنڈت نند لال کول طالب کشمیری نے ایک اہم رول ادا کیا تھا، پنڈت پریم ناتھ پٹواری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے، ایک ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شاعر بھی تھے، کشمیری اور اُردو میں شعر کہتے تھے، پہلے عاشق سوپوری کے نام سے لکھتے تھے، بعد میں مسرور

کشمیری کا قلمی نام اپنالیا۔

فنافی العشق ہونا ہی انجام محبت ہے
فنا ہوکر ہی عاشق نام ہم مسرور پاتے ہیں

تقسیم ملک سے پہلے مسرور کشمیری کی شعری تخلیقات مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتی تھیں ان میں رہنمائے تعلیم اور بہارِ کشمیر (لاہور)، رنبیر اور رتن (جموں) مارتنڈ، ینگ کشمیر اور جیون (سرینگر) قابلِ ذکر ہیں۔ 1939ء میں ریاستی محکمہ تعلیم مرحوم غلام احمد مختار کی سربراہی میں "تعلیم جدید" نامی رسالہ شائع کرتا تھا (مختار صاحب بعد میں ریاست کے ناظم تعلیم بھی رہے) تعلیم جدید نامی رسالہ مسرور کشمیری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ گو بہت دیر سے سہی لیکن مسرور کشمیری کی تین کتابیں، ژِنہ برم (کشمیری 1978ء) دَینہ پوش (کشمیری 1989ء) اور یادایام (اُردو 1991ء) شائع ہوچکی ہیں۔ مسرور صاحب کو اُردو علم وادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی تھی۔

1996ء میں وہ اپنے پیچھے ایک بیٹی اور تین بیٹوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر 78 برس کی تھی اور ان کے تین بیٹے ہیں......!

ورِیندر پٹواری، رجیندر پٹواری اور اشوک پٹواری

وریندر پٹواری اور اشوک پٹواری کہانی کار ہیں، وہ اُردو افسانوی ادب میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ راجندر پٹواری ایک چترکار ہیں۔

مسرور کشمیری کے ساتھ ہی ایک اور نام میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔ یہ نام مہندر رینہ کا ہے۔ وہ غزل کے شاعر تھے، ان کی شعری تخلیق خرام صبا 1961 میں شائع ہوئی تھی۔ اس مجموعے میں اُن غزلوں اور نظموں کا انتخاب شامل ہے جو انہوں نے 1960ء تک تحریر میں لائی تھیں۔

تاریکیوں میں ایک کرن اُبھری چلی گئی
گویا تمہاری یاد تھی، آئی چلی گئی

اُن کا یہ شعر بھی دیکھ لیجئے ۔

تم کو دیکھا ہے تو جینے کے سہارے جاگے
دل کے ویرانے میں گلپوش نظارے جاگے

خرام صبا کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

''میں ایک عرصے سے لکھ رہا ہوں، اس دوران میں نے اپنی شاعری کی نوک پلک سنوارنے اور فن سے روشناس ہونے کیلئے مجھے صرف اپنے اُن ذاتی دوستوں پر اکتفا کرنا پڑا جو میری طرح ہی یا تو کسی استاد کی تلاش میں تھے یا جو خود مجھ سے مل بیٹھ کر شاعری اور اُس کے فن کو زیر بحث لاتے، اس کے لئے یا تو کشمیر کا وہ کردار ذمہ دار ہے جس نے اسے ملک کے ایک سرے پر جگہ دی ہے یا زبان اُردو کے ان شاہ سواروں کا کردار، جنہوں نے اپنے سوا کسی دوسرے کو اپنا ہمنوا سمجھنا گوارا نہیں کیا۔ جنہوں نے اُردو کو خالص اپنی میراث سمجھا اور ملک کے دور افتادہ علاقوں میں رہنے والوں کی جسارت کو اپنی توہین سمجھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری ریاستی حکومت ان پر زر کثیر صرف کر کے انہیں یہاں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے کی دعوت دے کر انہیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ یہاں اردو کی قدر ہے، یہاں اُردو زندہ ہے اور یہاں اُردو لکھنے والے موجود ہیں ۔

نگاہیں دل کی باتیں کہہ چکی ہیں ذرا کہہ دیجئے کچھ تو زبان سے

خرام صبا میں ایک نظم کا عنوان ہے ''نوزائیدہ بچے کے نام'' مہندر رینہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ نظم اپنے دوست امین کامل کے صاحبزادے کی پیدائش سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ نظم کی شروعات ۔

خوشا نو بہار محبت کے پھول
خوشا زندگی کی بشارت کے پھول
خوشا تیری آمد ہے تجدید نور
خوشا روپ کے جگمگاتے شعور

✿✿✿

18

زندگی کے سناٹے

آج میں پہلے شجاع سلطان کی بات کروں گا۔ مجھے ریاست کے نامور اور منفرد چتر کار مرحوم غلام رسول سنتوش کی کہی ہوئی بات یاد آرہی ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر چتر کار کی تیسری آنکھ ہوتی ہے اور وہ اسی آنکھ سے اپنے کینواس، رنگوں اور لکیروں کو دیکھتا ہے۔ کینواس پر رنگ بکھیرتے بکھیرتے اپنی سوچوں کو عملی روپ دیتا ہے۔ ایک نقش ابھرتا ہے اور ایک تصویر وجود میں آتی ہے، چند روز قبل جب جموں سے ڈاکٹر لیاقت جعفری نے فون سے مجھے یہ اطلاع دی کہ شجاع سلطان اب ہمارے درمیان نہیں رہے تو مجھے احساس ہوا جیسے یہ تیسری آنکھ ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے جن پینٹنگز کی تخلیق کی ان میں وہ اپنے ماضی کو اُجاگر کرنے کے بعد اپنے روشن مستقبل کا سپنا دیکھ رہے تھے لیکن دل نے دھڑکنا بند کر دیا اور ان کا سپنا جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔ معبودِ حق انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین !!

تقسیم ملک کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں بہت ساری ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا لیکن جب 1970ء میں جموں وکشمیر رائٹرس کوآپریٹو سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تو میں نے اس کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینا شروع کیا۔ اس کا صدر دفتر اگر چہ بابا بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا لیکن وادی سے تعلق رکھنے والے اکثر قلم کار اور فنکار لالہ شیخ اینڈ سن ریسٹورنٹ میں قریب قریب ہر شام ملتے تھے، اس طرح یہ کوآپریٹو سوسائٹی کے سب آفس کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ یہاں ہی میری ملاقات آنجہانی بنسی نردوش سے ہوئی، وہ بھی سوسائٹی کے ایک اہم رکن تھے۔ وہ

ریڈیو میں بحیثیت ایک اسکرپٹ رائٹر تعینات تھے اور دفتری اوقات کے بعد اکثر لالہ شیخ ریسٹورنٹ میں آتے تھے، یہاں کچھ دیر بیٹھ کر مختلف حالات وواقعات پر بھر پور تبصرہ کرنے کے بعد روزنامہ آفتاب کے دفتر چلے جاتے، جہاں وہ پارٹ ٹائم کام کرتے تھے۔ اُن دنوں آنجہانی چمن لال چمن بھی کلچرل اکادمی کے ساتھ ساتھ آفتاب سے وابستہ تھے۔ چمن لال چمن کشمیری زبان کے ایک بیدار مغز شاعر تھے، ان کی شعری تخلیق ''شبنمی شار'' 1963ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں چمن لال چمن کی 1957ء سے لے کر 1963ء تک کی شعری تخلیقات شامل ہیں۔

بنسی نردوش کہانی کار تھے، ڈرامہ بھی لکھتے تھے، وہ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے، اس کے علاوہ ایک صحافی بھی تھے، دراصل انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے ہی کیا تھا۔ ان میں سیاسی شعور بھی تھا، وہ کشمیر کے سیاسی حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اُس زمانے میں ریڈیو میں بھی ایک اچھا خاصا ادبی ماحول تھا۔ یہاں میر غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، کمال احمد صدیقی، قیصر قلندر، علی محمد لون، پران کشور اور امیش کول جیسی بلند قامت شخصیات ریڈیو کی زلفوں کو سنوارنے اور سجانے میں ایک اہم رول ادا کر رہے تھے۔

بنسی نردوش کے تین افسانوی مجموعے ''بال مرآیو'' (1961ء)، ''آدم چھو تھے بدنام'' (1970ء) اور ''گرداب'' (1973ء) شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کشمیری زبان میں دو ناول بھی لکھے ہیں۔ ''موکہ جار'' اور ''اکھ دور'' (1976ء)۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے بہت سے ڈرامے بھی لکھے، دونوں کشمیری اور اُردو زبانوں میں۔ ان کے ریڈیو ڈراموں کے بارے میں پران کشور لکھتے ہیں:

> ''بنسی نردوش بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، لیکن ریڈیو کے لئے انہوں نے بہت سے جاندار ڈرامے لکھے۔ ان کا تحریر کردہ کشمیری ڈرامہ ''بس اکھ طما''، بہت مقبول ہوا۔''

بنسی نردوش کا اصل نام بنسی لال ولی تھا۔ وہ 1930ء میں بڈیار سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے پتاجی کا نام شیام لال ولی تھا لیکن وہ بحیثیت ایک قلم کار تیرتھ کاشمیری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کے گھر میں ادبی محفلیں سجتی تھیں، اس زمانے کے قلم کار، ادیب اور شاعر تیرتھ کشمیری کے گھر آتے تھے۔ ان ادبی محفلوں کا مجموعی اثر بنسی نردوش کی علمی اور ادبی زندگی پر بھی پڑا۔ وہ جب دسویں جماعت میں پڑھتے تھے تو انہوں نے اپنی پہلی کہانی ''مادھورام کی واپسی لکھی''، جو اخبار ''ہمدرد'' میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز ''ہمدرد'' کے مدیر ہوا کرتے تھے اور پھر کہانیاں لکھنے کا یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ 1948ء میں وہ امرتسر چلے گئے اور وہاں اخبار ''شیر بھارت'' میں ایک کالم نگار اور ترجمہ کار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ شیر بھارت کے بعد وہ روزنامہ ''نیا زمانہ'' جالندھر کے سٹاف میں شامل ہوگئے۔ جالندھر سے واپسی پر انہوں نے سرینگر میں اخبار ''جہانِ نو'' میں کام کرنا شروع کیا۔ اس اخبار کے مدیر و مالک میر غلام محمد راجپوری تھے۔ پھر بنسی نردوش روزنامہ ''خدمت'' میں آگئے اور پنڈت نندلال واتل کی رہبری میں کام کرتے رہے۔ اس کے فوراً بعد ریڈیو میں آگئے اور بحیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کرتے رہے۔ وہ ریڈیو سے ہی سبکدوش ہوگئے۔

میرے ایک دوست راجندر ملہوترہ کے کہنے پر بنسی نردوش نے مرحوم غلام محمد صادق کی تقاریر پر مشتمل ایک انتخاب ''صبح صادق'' کے نام سے ترتیب دیا۔ صادق صاحب کی شخصیت کے مختلف سیاسی، ادبی اور علمی پہلوؤں کو ان کی تقاریر کے پس منظر میں اُبھارنے کی یہ ایک کامیاب کوشش تھی۔

بنسی نردوش 1990ء میں جموں چلے گئے اور پھر وہاں سے لوٹ کر نہ آئے۔ جموں میں اپنے قیام کے دوران وہ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ البتہ ڈاکٹر پریمی رومانی کے ہاں اکثر جاتے تھے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کے ہاں انہیں وہ ادبی ماحول ملتا تھا جو اُن کی ایک کمزوری تھی!!!

21 راگست 2001ء میں ان کا دیہانت ہوگیا!!

✿✿✿

19

بذلہ سنجی کا امام: شوکت تھانوی

شوکت تھانوی کی وفات پر معروف کالم نویس ابراہیم جلیس نے کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر خوشیاں مسکراہٹیں اور قہقہے زمین سے ہی جاتے ہیں اور جب کبھی آسمان پر خوشیوں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کا ذخیرہ ختم ہوتا ہے یا پرانا ہو جاتا ہے تو نئی مسکراہٹیں اور تازہ قہقہے زمین سے ہی منگوائے جاتے ہیں اور شاید پطرس، سالک، مجید لاہوری، حاجی لق لق، چغتائی اور چراغ حسن حسرت جو مسکراہٹیں اور قہقہے جنت کے باشندوں کے لئے لے گئے تھے وہ ختم ہو گئے تھے اور جنت کے باشندے نئی مسکراہٹوں اور تازہ قہقہوں کے لئے بے چین ہو گئے تھے۔۔۔ جبھی تو شوکت تھانوی کو آسمان پر طلب کرلیا گیا......!!

شوکت تھانوی کا اصل نام محمد عمر تھا، وہ 1907ء میں پیدا ہوئے اور 4 / مئی 1963ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

شوکت تھانوی بیک وقت کالم نگار، مزاح نگار طنز نگار، ظریف، لطیفہ گو، بذلہ سنج، مضمون نگار، افسانہ نگار، پیروڈی گو شاعر، مزاحیہ شاعر، ڈرامہ نویس، صحافی، ریڈیو اور فلم آرٹسٹ تھے، وہ ہر لحاظ سے ایک باغ و بہار انسان تھے، بہارِ بے خزاں کا مہکتا ہوا پھول تھے۔

شوکت تھانوی کے تحریر کردہ خاکے نہایت ہی دلچسپ ہیں، یہ خاکے اُنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھے ہیں، سید جالب دہلوی کے بارے میں تحریر کیا:

> ''کھانے کے بڑے شوقین تھے، میٹھی چیزوں سے خاص رغبت تھی، دعوتوں میں جہاں تک ہوتا تھا خود ہی جاتے تھے، اسٹاف کے کسی رُکن کو تکلیف دینا پسند نہ کرتے تھے۔''

مولانا عبدالباری آسی صاحب کے بارے میں:

''مولانا پر عجیب بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے، شیروانی میلی ہے تو خوش ہیں کہ پجامہ تو اُجلا ہے، پجامہ میلا ہے تو مطمئن ہیں کہ قمیض بالکل صاف ہے، خط بڑھا ہوا ہے تو اطمینان ہے کہ خضاب کا رنگ تو قائم ہے، شوق ہے شطرنج کا اور قلمی کتابوں کا، مرعوب ہیں الہٰ آباد کے امرود سے، مشغلہ ہے صرف پڑھنا لکھنا اور بے گار ہے شاگردوں سے سر کھپانے کی''

اسی طرح رفیع احمد خان کا خاکہ یوں کھینچتے ہیں:

''رفیع احمد خان ایم اے مجھ سے اس قدر قریب ہیں کہ ان کی ذہانت، اُن کے تجربے اور اُن کی بلا کی حاضر جوابی پر غصہ آتا ہے کہ یہ شخص اتنا بلند ہو کر اس پستی میں زندہ رہنا کیوں گوارہ کئے ہوئے ہیں۔''

آغا حشر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ریشمی تہبند باندھے دیکھتے کسی اور طرف تھے اور نگاہیں کسی اور طرف ہوتی تھیں، کبھی اس کو ڈانٹ اور کبھی اُس کو ڈپٹ، گالی گلوچ میں کوئی عذر نہیں مگر خود نہایت پھرتیلے، نہایت محنتی اور بظاہر نہایت چلتے ہوئے!''

اور پھر مجنون گورکھپوری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''معلوم نہیں یہ تخلص شعر کہنے کے لئے رکھا ہے یا اپنا تعارف کرانے کے لئے، آپ کی پوری شخصیت آپ کے تخلص میں سما کر رہ گئی ہے اس جسامت کے لئے یہی تخلص اور اس تخلص کے لئے یہی جسامت ہونی چاہیے تھی''

اور آخر میں افسر میرٹھی:

''حامد اللہ افسر میرٹھی، بچپن سے آپ کی نظمیں پڑھ رہے ہیں مگر اب بھی آپ ہمارے برابر نظر آ رہے ہیں، معلوم نہیں یہ لوگ تھرماس میں بیٹھ کر اپنی عمر کو ایک جگہ قائم رکھتے ہیں یا مصری ممی پر لگانے والا مسالہ کہیں سے ہاتھ آ گیا ہے۔''

شوکت تھانوی مرحوم کے نہایت دلچسپ مزاحیہ ناول یہ ہیں:

معمہ خاتون ..... غزالہ ..... سپنے ..... خدانخواستہ ..... سسرال ..... کارٹون ..... بکواس ..... سوتیا جاہ ..... خاتم خان ..... دل پھینک ..... مولانا ..... سانچ کو آنچ ..... بیوی ..... مسٹر 1958 ..... جوڑ توڑ

ان ناولوں کے علاوہ ان کے تحریر کردہ مزاحیہ مضامین کے کئی مجموعے بھی ہیں۔ چند نام یہ ہیں:

مسکراہٹیں ..... برقِ تبسم ..... نورتن .... لونڈی ..... کانٹے ..... گرگٹ ..... کائناتِ تبسم ..... شیش محل !!

انہوں نے بے شمار ڈرامے بھی لکھ گئے ہیں، ریڈیو کے لئے مزاحیہ اور طنزیہ ڈراموں میں کئی کرداروں کی تخلیق کی جو اب بھی زندہ اور جاوید ہیں۔ فلموں کے لئے لکھا اور کام بھی کیا۔ شوکت تھانوی کی کہانیوں پر پاکستان میں کئی فلمیں بنائی گئیں، ہندوستان میں بھی شوکت تھانوی کی ایک مزاحیہ ناول کے پسِ منظر میں ایک فلم بنی تھی، نام تھا راجہ صاحب ..... اس میں ششی کپور اور نندہ نے کلیدی رول نبھائے تھے، اس فلم کا منظر نامہ اور مکالمے برج کیتال نے تحریر کئے تھے اور ہدایت کار سورج پرکاش تھے۔

شوکت تھانوی کو اپنے قلم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ بغیر ایک لفظ یا ایک نقطہ کاٹے لکھتے تھے، مسودہ ہمیشہ صاف اور خوشنما ہوتا تھا، اُن کے تحریر کی خوشنمائی قابل دید ہوتی تھی، اُن کی طبیعت میں بھی اسی انداز کی صفائی اور نزاکت تھی جیسی اُن کے الفاظ کی نوک پلک میں !!

ماہنامہ نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل کہتے ہیں کہ ایک رات شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح اُن کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحے کا ناول تیار تھا..... اس ناول کا نام بیوی ہے..... !

شوکت تھانوی بحیثیت شاعر...... پہلی غیر شعوری کوشش

نہ روٹی نہ سانس میں بھوکا رہوں
ارے میرے اللہ میں کس سے کہوں

پہلی مطبوعہ غزل کا پہلا شعر

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں جا کر ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں

پہلا مزاحیہ شعر۔

ہم ذوق نظر تری تائید نہیں کرتے
اس درجہ بھی تو کورانہ تقلید نہیں کرتے

آخری شعر۔

دن نکلتا ہے تو آتی ہے مجھے رات کی یاد
رات آتی ہے تو ایک تازہ بلا لاتی ہے

شوکت تھانوی کی وفات پر غلام احمد فرقت کاکوروی نے کہا تھا:

''شوکت تھانوی کی موت صرف شوکت تھانوی کی موت نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں لطیفہ گوئی کی موت ہے کیونکہ وہ جس محفل میں تھوڑی دیر کے لئے پہنچ جاتے تھے اُس محفل کو اپنے لطیفوں سے گل و گلزار بنا دیتے تھے.....''

جی ہاں، شوکت تھانوی کی موت صرف ایک مزاح نگار کی موت نہ تھی بلکہ اس موت کے معنی تھے ہنسی کی موت، زندہ دلی اور شادابی سے پر کیف لمحات کی موت......!!

اور آخر میں شوکت تھانوی کی ایک مختصر مختصر تحریر:

''میں نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا'' شیطان نے ہم کو بہکایا،
وہ گھبرا کو بولی......''اب کیا ہوگا؟''
میں نے بڑی معصومیت سے کہا
''اللہ مالک ہے۔''

❁❁❁

سوزِ منظر

مرزا کمال الدین شیدا کے والد گرامی مرزا جلال الدین کی فارسی علم وادب سے گہری وابستگی تھی۔ ان کی شعری تخلیق ''حسن و گوہر'' فارسی ادب میں اہمیت کی حامل رہی ہے۔ آپ نعتیہ کلام بھی لکھتے تھے۔ مرزا کمال الدین کے تایا مرزا اسعد الدین مجاہد بھی اپنے عہد کے معروف فارسی گو شعرا میں سے تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی سے کافی متاثر تھے۔ اس لحاظ سے مرزا کمال الدین شیدا کو طالب علمی کے زمانے سے ہی گھر میں ادبی ماحول میسر تھا۔

مرزا کمال الدین شیدا کو اسکولی زمانے سے ہی شعر و شاعری میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں لطیف داد خان، جو کہ اسٹیٹ ہائی سکول باغ دلاور خان میں اُردو کے استاد تھے، مرزا صاحب کو مشق سخن میں مدد دیتے تھے، کالج کے زمانے میں بھی انہیں اپنے ذوق سخن کو نکھارنے کا موقع ملا اور وہ کالج کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔

1931ء میں وہ سرکاری ملازمت میں آگئے لیکن شعر و شاعری سے ان کی دلچسپی برقرار رہی

مرگ عشق میں ہی حیات جاوداں کا راز ہے
ٹوٹ کر جو نغمہ بن جاتا ہے یہ وہ ساز ہے

1958ء میں ریاست میں کلچرل اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا اور مرزا کمال الدین شیدا اس کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ یہاں ریاست اور ریاست سے باہر کے قلم کاروں، شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کے تعلقات اور مستحکم ہو گئے۔ حال ہی میں انہیں کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے فرائض انجام دینے کے تعلق سے انعام سے نوازا گیا۔ یہ پس از مرگ انعام ان کے فرزند نے حاصل کیا۔

1967 ء میں مرحوم پروفیسر سروری نے شیدا صاحب کی نظموں کا انتخاب کیا اور یہ انتخاب ''سوز ومنظر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

ارمغانِ شیدا کے عنوان سے مرزا کمال الدین کی ایک اور شعری تخلیق 1983 ء میں شائع ہوئی۔ یہ شعری مجموعہ گلشن پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب کو علامہ اقبال سے گہری عقیدت تھی۔ اقبال چیئر اور پھر اقبال انسٹی ٹیوٹ قائم ہوئے تو مرزا صاحب نے سلطان العارفین اقبال ایوارڈ نام سے طلباء میں اقبالیات کا ذوق عام کرنے میں ایک گراں قدر عطیہ اوقاف اسلامیہ سے دلوایا۔''

کشمیر میں فقیرِ ملت سید میرک شاہ کاشانی کے نام سے کون واقف نہیں۔ آپ 1971 ء میں انتقال فرما گئے۔ آپ کی وفاتِ پرملال پر مرزا کمال الدین شیدا نے خراجِ عقیدت کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی۔

وہ سراپا سوز تھا جاندار جانداروں میں تھا
آسمانِ معرفت پر چاند وہ تاروں میں تھا
باہمی اخلاص کے روشن کیئے جس نے چراغ
دے گیا وہ مردِ کامل ظاہری تربت کا داغ

اسی طرح بابا پیام الدین ریشی کے تعلق سے مرزا صاحب نے جو نظم لکھی ہے وہ ان کی والہانہ عیقدت کا اظہار ہے۔

رات کی تاریکیوں میں ہے یہاں نورِ سحر
اس چمن کا خار بھی ہے، حاملِ رنگ و بہار

مرزا صاحب کی ایک اور نظم ہے...... ''کشمیر کو ہے موئے مقدس کا سہارا''

مرزا کمال الدین کو زبان و بیان پر کافی دسترس تھی اور ان کے کلام میں جو جواہر پارے ملتے ہیں ان میں زندگی اور انسانیت کے بلندترین عظمتیں سامنے آتی ہیں۔

مرزا صاحب کا نعتیہ کلام بھی بے حد پُر اثر ہے۔

❁❁❁

21

انسانیت زندہ ہے

لالہ ملک رام صراف ریاست جموں و کشمیر میں بابائے صحافت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ 18 / اپریل 1894 کو سانبہ جموں میں پیدا ہوئے اور 1920ء میں قانون کی تعلیم ترک کر کے لالہ لاجپت رائے کے لاہور سے شائع ہونے والے اخبار ''بندے ماترم'' میں بحیثیت سب ایڈیٹر کام کرنے لگے، اپنا اخبار نکالنے کی تڑپ اُنہیں پھر سے جموں لے آئی اور 1921ء میں مہاراجہ صاحب سے اپنا اخبار نکالنے کی اجازت مانگی۔ اجازت حاصل کرنے کیلئے انہیں ایک طویل عرصہ تک انتظار کرنا پڑا، بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری، وہ اپنے مقصد کیلئے حاکمانِ وقت سے لڑتے رہے۔ آخر کار انہیں 1924 میں جموں سے اخبار ''رنبیر'' شائع کرنے کی اجازت مل گئی۔ اخبار رنبیر کا پہلا شمارہ 24 / جون 1924ء کو شائع ہوا، اس دور کے قلمکاروں کو اپنے خیالات پیش کرنے کیلئے اخبار کی صورت میں ایک پلیٹ فارم مل گیا اور وہ باقاعدگی کے ساتھ اخبار رنبیر میں چھپنے لگے، اُن قلمکاروں میں شاعر کشمیر غلام احمد مہجور، ذوالفقار علی نسیم، قیس شیروانی، صاحبزادہ محمد عمر، سردار بدھ سنگھ، مرزا غلام حسن بیگ عارف، سردار مہندر سنگھ اور آننت رام ڈوگرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

لالہ ملک راج کے پانچ صاحبزادوں میں سے اوم صراف، سورج صراف اور ست صراف صحافت سے وابستہ ہیں، اُن کے ایک بیٹے پریم صراف محکمہ لائبر ریز میں ایک اہم عہدہ پر فائز رہنے کے بعد سبکدوش ہو چکے ہیں، اُن کے ایک اور بیٹے وید راہی ایک معروف کہانی کار، ناول نگار اور شاعر ہیں، وہ ان دنوں فلموں سے وابستہ ہیں۔

1979 ء میں لالہ جی پاکستان گئے تھے۔ انہوں نے 14 / نومبر سے 27 نومبر 1979 ء پاکستان میں قیام کیا، اپنے سفر نامہ کو انہوں نے کتابی صورت دی ہے، یہ سفر نامہ ''میری پاکستان یاترا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس سفر نامے کو انہوں نے اپنی ایک اور کتاب ''انسانیت ابھی زندہ ہے'' میں شامل کیا ہے جو 1982 ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں مختلف قلمکاروں ، صحافیوں اور سیاستدانوں کے تاثرات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ تاثرات پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھار ایک دیانتدار ، اصول پسند اور دور اندیش صحافی ایک انفرادی مشن لے کر چلتا ہے اور خیر سگالی قائم کرنے میں وہ کر دکھاتا ہے جو لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کر کے حکومتیں یا سرکاریں حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ پاکستان جانے کا صراف صاحب کا اصل مقصد ایک جذباتی سفر تھا تا کہ اپنے دوستوں سے مل لیں جو تقسیم ملک یا اس سے پہلے اُن کے قریب تھے، اس میں بقول خواجہ احمد عباس، انہیں مکمل کامیابی نصیب ہوئی، جس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانیت پاکستان میں زندہ ہے بلکہ صراف صاحب کی اپنی ذات اور کردار کی خوبی ہے کہ وہ بھی اس انسانیت کو باہر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں، لاہور سے واپسی پر صراف صاحب کا جو بیان مقامی اخباروں میں شائع ہوا، میں اُسے اس مضمون کا حصہ بنانا چاہتا ہوں:

> ''جو حقیقی مسرت اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں اپنے چند روز قیام اور اپنے دوستوں سے مل کر ہوئی ہے وہ مجھے کم جگہوں پر نصیب ہوئی ہے، میں اسے اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں۔ جس خلوص، محبت اور گرمجوشی کے ساتھ میرے دوستوں بالخصوص میرے ہم وطن جموں کے مسلمان بھائیوں، بہنوں بلکہ بچوں نے بھی میرے یہاں آنے کا خیر مقدم کیا، وہ ناقابل فراموش ہے!''

کتاب میں ایک طویل مضمون شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون عزیز کاشر

نے لکھا ہے۔ عنوان ہے ''جموں کی یاد'' یہ مضمون بے حد جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

لالہ جی نے اپنی تالیف میں جانی پہچانی شخصیات کے علاوہ جموں سے تعلق رکھنے والے اکثر اصحاب کا ذکر کیا ہے، اُن کے بارے میں انفرادی طور پر لکھنا ممکن نہیں لیکن میں یقین علی مسکین کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے ''رنبیر'' اور ''رتن'' میں بطور خوش نویس اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا تھا، انہوں نے بیس سال تک لالہ جی کے ساتھ کام کیا پھر پاکستان بننے پر جموں سے پاکستان چلے گئے۔ صراف صاحب نے اُن کا ذکر نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

سفر پاکستان کے دوران کلیم اختر نے 21 رنومبر 1979ء کو ایک غزل لالہ جی کو سنائی تھی۔ اس غزل سے ایک شعر۔

گو بچھڑ کے بہت دور آ گیا پھر بھی اے شہر دلدار کے ساکنو
وہ مکان اس کے دیوار و در یاد ہیں، صحن و دالان اور کھڑکیاں یاد ہیں!

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ان دنوں خوشگوار ماحول نظر آرہا ہے۔ لگتا ہے کہ آنجہانی ملک راج صراف کا پاکستان کا سفر بھی اُس کی ایک کڑی ہے اور...... دونوں ملکوں کے عوام میں انسانیت تب بھی زندہ تھی اور آج بھی زندہ ہے......!!

❁❁❁

22

ایک خط اور بہت سی یادیں

حال ہی میں میری ڈائری کے اوراق پر مشتمل میری نئی کتاب ''بند کمرے کی کھڑکی'' منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے تعلق سے مجھے پروفیسر شکیل الرحمن کا ایک طویل خط ملا ہے۔ پروفیسر صاحب کئی برس شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ تھے، وہ بعد میں ممبر پارلیمنٹ بھی، اور آنجہانی چندر شیکھر کی مرکزی کابینہ میں وزیر صحت کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ وہ ان دنوں دہلی میں قیام پذیر ہیں اور حسب معمول لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں، اپنے اس خط میں اور باتوں کے علاوہ اُنہوں نے اُن بہت سارے دوستوں اور رفیقوں کا ذکر کیا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

لکھتے ہیں:

''آپ کی کتاب ''بند کمرے کی کھڑکی'' موصول ہوئی۔ یادوں اور واقعات کا خوبصورت مجموعہ ہے، آپ کے اوراق کا مطالعہ کرتے ہوئے میری بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں، کئی یار دوست یاد آئے، کچھ ایسے کہ جن کے گزر جانے کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ علی محمد لون، پشکر ناتھ، تیج بہادر بھان، نور محمد روشن، غلام رسول سنتوش، حکیم منظور، بنسی نردوش، بنسی پاریمو، اجیت کمار بخشی، شنکر رینہ۔ یار دوستوں کی ایک بڑی دنیا سمٹ گئی، میرے عزیز دوست ڈاکٹر برج کرشن ایمہ (برج پریمی) بھی گزر گئے، بہت یاد آتی ہے اُن کی، کشمیر میں وہ میرے عزیز تر دوست تھے، قیصر قلندر بھی چلے گئے، بہت دُکھی بنا گئے یہ لوگ، جب میں پالیمنٹ میں تھا تو تیج بہادر بھان مجھ سے ملنے آئے تھے، اپنی تازہ تصنیف دی

اور حسب عادت بڑی محبت کے ساتھ مجھے برا بھلا کہا تھا، بنسی پاریمو بھی آئے تھے تو کشمیر کے تعلق سے ایک نوٹ بھی دئے گئے جسے میں نے اُس وقت کے وزیر اعظم کو بھیج دیا تھا، مجھے چند عمدہ سفارشات پسند آئی تھیں، حکیم منظور سے بھی کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تھی، ہم خوب ہنستے تھے، قیصر قلندر نے مجھے چند خط لکھے تھے اپنی کتابوں کے تعلق سے۔ 1956ء سے تعلق تھا 57-1956ء کے ادبی جلسے یاد آئے جن میں خواجہ غلام محمد صادق، ڈی پی دھر، میر قاسم وغیرہ ایک دو بار شریک ہوئے تھے۔ نور محمد روشن اُس زمانے میں بہت متحرک تھے، عبدالحق برق بھی میرے قریب تھے، اکثر ریڈیو سٹیشن کے سامنے والے پارک میں اُن سے اور پران کشور سے خوب باتیں ہوتی تھیں۔

آپ کی تحریر نے مجھے ایک بار پھر کشمیر پہنچا دیا جہاں میں نے بتیس برس سانس لی ہے۔ جہاں پوری جوانی گزر گئی، واپس آیا تو ضعیف ہو چکا تھا۔

"اے حافظ جب تو ضعیف ہو چکا ہے میکدہ سے باہر چلا جا۔ یہ جورندی اور عشق بازی ہے وہ جوانی میں بہتر ہے......!!"

سچ کہتا ہوں کشمیر میں رہتے ہوئے عہد جوانی ہنس ہنس کر کاٹا، اب یہی تمنا ہے کہ آپ لوگ مجھے یہاں سے اُٹھا کر کشمیر لے جائیں گے اور دو گز زمین دیں گے، اپنے بیٹے کی لحد کے قریب جو 1956ء سے وہاں ابدی نیند سو رہا ہے اور کشمیر کی مٹی کے ذرے میرے ننھے لخت جگر کو لوری سنا رہے ہیں......!!

آپ کی کتاب پڑھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ آپ کا حافظہ کتنا تیز ہے۔ کتنی ساری باتیں آپ کو یاد ہیں، میرے لئے کتاب کا ہر صفحہ ایک منظر ہے، ہر صفحے پر ایک تصویر اُبھرتی ہے اور بہت کچھ کہہ جاتی ہیں...... یہ سلسلہ جاری رکھئے، آپ ایک اچھے کالم نگار ہیں!

کشمیر میں شمیم احمد شمیمؔ میرے بہت اچھے پیارے دوست تھے جن سے جھگڑے بھی خوب ہوتے تھے، اُن کی پیاری اور دلچسپ شخصیت بھی اوجھل ہوگئی، جانے کتنے لوگ میری یادوں میں بسے ہوئے ہیں۔ اپنے عزیز شاگردوں میں محمد امین اندرابی اور اجیت کمار بخشی کو اب بھی اپنے قریب محسوس کرتا ہوں۔''

پروفیسر شکیل الرحمٰن بابا سائیں کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل اُنہوں نے اسی نام سے ماہنامہ بیسویں صدی میں سیاسی اور ادبی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان مضامین کا عنوان تھا ''بابا سائیں'' نے کہا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری ڈائری کے اوراق پڑھ کر ڈاکٹر صاحب کے ذہن کی بند کھڑکی سے بہت پرانی یادیں اُبھر آئی ہیں، اپنے خط میں انہوں نے چند اُن دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے جو خدا کے فضل وکرم سے حیات ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر رحمان راہی، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر حامدی کاشمیری، امین کامل، پروفیسر شمس الدین احمد میری یادوں میں بسے ہوئے ہیں، اُن کی یاد آتی ہے تو محبت کے رشتے کیا ہوتے ہیں اس کا احساس ہوتا ہے۔

خواجہ ثناءاللہ بھٹ سے ملاقات ہو یا فون پر گفتگو ہو تو میرا سلام کہیے گا۔ مجھے یاد ہے جب اُن کے اخبار کی پہلی اشاعت ہوئی تھی، آفتاب تو دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر کی اُردو صحافت کا علامت بن گیا۔ ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' خوب لکھتے رہے......!!
کشمیر عظمیٰ کیا مجھے دلی میں مل سکتا ہے......!!!''

❁❁❁

نوٹ: پروفیسر شمس الدین احمد بھی اب حیات نہیں۔

23

دوسری برف باری سے پہلے

کرشن چندر 23 / نومبر 1913 ءکو بھرت پور راجستھان میں پیدا ہوئے اور 8 / مارچ 1977 ءکوممبئی میں وفات پا گئے۔ اُن کے والد ڈاکٹر گوری شنکر کافی عرصہ ریاست جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات رہے ہیں اور اس وجہ سے نہ صرف کرشن چند بلکہ اُن کے برادرِ اصغر مہندر ناتھ اور بہن سرلا دیوی کی زندگیوں کا بہت عرصہ پونچھ میں گذرا۔ پونچھ سے انہیں کس قدر محبت تھی، لگاؤ تھا اُس کا اظہار انہوں نے اپنے سفر نامہ ''ورق ورق کھوگئی زندگی'' میں کھل کر کیا ہے، یہ پونچھ کا اُن کا آخری سفر تھا وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلہ میں یہاں آئے تھے، اس سفر میں یونٹ کے لوگوں کے علاوہ سلمیٰ صدیقی اُن کے ساتھ تھیں اور اس سفر کا سارا انتظام اُن کے قریبی دوست مرحوم غلام رسول رینزو نے کیا تھا...... بقول کرشن چندر:

> ''کتنے ہی راستے ہیں میرے دل میں جو پونچھ کو جاتے ہیں، جدھر سے بھی چلتا ہوں پونچھ پہنچ جاتا ہوں، اس شہر کے عکس اکثر میری تنہائیوں میں چمک اُٹھتے ہیں......''

اُردو زبان وادب کے عظیم افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کی اپنی ایک اہمیت اور افادیت ہے، اُردو افسانے کو انہوں نے ایک نیا انداز دیا، ایک نئی جہت دی، اُن کا اندازِ بیاں نہایت شگفتہ، حسین، دل کش اور رواں دواں رہا ہے، انہوں نے کئی ناول بھی لکھے جو بہت مقبول ہوئے لیکن اُن کے اکثر پڑھنے والے انہیں اُردو کا بڑا ناول نگار ضرور تسلیم کرتے ہیں لیکن اُن کی یہ بھی رائے ہے کہ ناول نگار کی

نسبت وہ بہتر افسانہ نگار ہیں اور بقول ڈاکٹر اریبنوی:

''اُن کے افسانوں میں تابناک ہیرے ملتے ہیں ، ناولوں کے سنگستان میں ابھی تک کوئی ہیرا نہیں پایا۔''

کرشن چندر کے پہلے تحریر کردہ افسانے کا عنوان تھا ''جہلم میں ناؤ پر'' دیکھے پونچھ سے ان کی محبت کا ایک اور نمونہ......!

''شوٹنگ سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کئی گھروں سے ناشتہ آچکا ہے، پونچھ کی دو چیزیں موجود تھیں، مکی کے ٹوڑھے، مکی کے پراٹھے، موٹھی کا سالن اور کئی قسم کا ساگ، گیسٹ ہاؤس والوں نے بھی نان و تیج ناشتہ تیار کیا تھا لیکن ہم لوگ مکی کے پراٹھوں اور موٹھی پر بری طرح گرے۔''

اپنے زمانے کے نامور قلمکار، ناقد اور دانشور کرشن چندر کے بارے میں کیا کہتے یا لکھتے رہے ہیں، میں مختصر الفاظ میں اُن کی تفصیل پیش کرنے کی جسارت کروں گا......

''جو چیز کرشن چندر کو عام ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اپنے نفس مضمون کے بیان اور خیالات کے اظہار میں اُن کی بے تعصبی ہے اُن میں جوش و خروش ہے لیکن تعصب نہیں، ایک ذاتی ہمدردی ہے یہی سچی انسانی ہمدردی اشتراکیت کا سب سے بڑا جوہر ہے۔''

عزیز احمد (دیباچہ پرانے خدا)

اور عادل رشید لکھتے ہیں:

''وہ شاعر نہیں ہے لیکن شعر سمجھتا ضرور ہے اور نثر میں ایسے ایسے حسین شعر کہتا ہے کہ بڑے بڑے مانے اور جانے ہوئے شاعر بھی حیران رہ جاتے ہیں، میں اُس کی شاعری کا جو وہ نثر میں کرتا ہے دیوانہ ہوں۔''

کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ اپنے ایک طویل مضمون ''میرے بھائی سب کا افسانہ نگار (شاعر ممبئی 1967ء) میں لکھتے ہیں:

گھریلو زندگی میں انہوں نے مجھے بڑا بھائی مانا اور اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کیا، گھر میں شادی ہو تو روپے مجھے دیں گے تم کرو گے سارے اخراجات، سرالا بہن کی شادی ہوئی تو یہی کچھ کیا، کرشن جی کے چھوٹے بھائی وریندر کی شادی ہوئی تو میں چھوٹا ہو کے بھی بڑے بھائی کے فرائض انجام دیتا رہا، گھر کے جھگڑے مجھے سونپ دیتے تھے اور میں اُنہیں نپٹاتا، دراصل اس طرز عمل کی وجہ سے میرا گھر والوں پر اور گھر سے باہر بھی اچھا خاصا اثر بیٹھ گیا، دراصل لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اس اچھائی کا سر چشمہ کون ہے......''

سید احتشام حسین کرشن چندر کے بارے میں فرماتے ہیں:
''مجھے کرشن چندر اس لئے پسند ہیں کہ اُن کے افسانوں کے موضوعات کا تنوع بہت ہے اُن کے مشاہدے کی دنیا وسیع ہے اور اُن کی عقابی نگاہ میں ربط اور بے ربطی دونوں کو اندر اور باہر سے دیکھ لیتی ہے۔''

''جب کہ دنیا کے کروڑوں انسان امن، روٹی ور گلاب کا پھول نہ پائیں گے کرشن چندر اپنے دل کا سارا درد، اپنی روح کا سارا کرب، اپنی کہانیوں میں سمو کر اس محرومی کو یاد دلاتے رہیں گے کیونکہ انہیں انسان سے محبت ہے......'' (نجمہ سمیع)

''کرشن چندر کا انسان جبلی طور جمال پرست ہے، وہ ہر چیز کا عاشق اور دلدادہ ہے جو حسین ہے، لذیذ ہے، رنگین ہے، عطر بیز ہے، پرنغمہ ہے......'' (ریوتی سرف شرما)

ہمارے ریاست کے معتبر ناقد محمد یوسف ٹینگ کرشن چندر کے بارے

ہیں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''کرشن چندر کے فن کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ہمیشہ ایک آبشار کا نقشہ اُبھر آتا ہے، رنگوں کی ویسی ہی برساتیں، ویسی ہی فسوں آمیز طلسماتی فضا، ویسی ہی خوردا اور تازہ شاداب خوبصورتی اور اسلوب کی ویسی ہی بے روک بے باک روانی......!''

(شیرازہ سرینگر)

ڈاکٹر ملک راج آنند اپنے ایک خط میں کرشن چندر کو لکھتے ہیں:

''میں آپ کے ساتھ اُس روشنی میں یقین کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے عوام کی کالی اور بھوری آنکھوں میں ہے، خوبصورت عورتوں میں ہے اور معصوم بچوں میں ہے اور میں اس پر یقین کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اور میرے دوسرے ہمعصر اس روشنی میں ڈوب چکے ہیں۔''

اور آخر میں آنجہانی کرشن چندر کے ناول ''دوسری برف باری سے پہلے'' سے چند جملے......

''اپنے سوکھے دبلے پتلے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے بالآخر دیپاولی وہیں اُس کے بستر پر سو گئی، اُسے سوتے دیکھ کر گورگانی کا دل عجیب طریقے سے پگھلنے لگا اُسے لگا کہ اُس کی چھ ماہ کی مردہ بچی پھر سے زندہ ہوگئی ہے اُس نے اس بچی کو اپنے سینے سے لگا کر اُس کا ماتھا چوم لیا، یکا یک تیز و تند آنسوؤں کی جھڑی اُس کی آنکھوں سے بہہ کر اُس کی دس بارہ روز کی بڑھی ہوئی داڑھی میں جذب ہونے لگی...... کیا یہ جذبے نہیں مرتے...... کیا یہ جذبے کبھی نہیں مرتے......!!!''

✿✿✿

24

گلابی شہر کا شاعر

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا، میں جموں جانے کے لئے سرینگر ایئر پورٹ پر کسی سے بات کر رہا تھا کہ قریب ہی حسرت جے پوری نظر آئے ۔ میں نے اپنا تعارف کرایا پہلی ملاقات تھی۔ اس لئے مجھے پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرا نام سن کر وہ صرف مسکرا دیئے اور مجھے لگا کہ وہ میرے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ میں جانتا تھا کہ موہن یاور ان کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اس لئے میں نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے موہن یاور کا نام لیا، وہ چونک پڑے اور کہنے لگے:

''میں تو موہن یاور سے ابھی ملنا چاہتا ہوں..... کہاں ہیں وہ؟''

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

''وہ جموں میں ہیں اور جموں یہاں سے بہت دور ہے، اس لئے ملاقات ممکن نہیں۔''

کچھ مدت بعد مجھے وہ خط دیکھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے موہن یاور کو ممبئی سے لکھا تھا۔ اس خط میں میری اور حسرت جے پوری کی مختصر سی ملاقات کا بھی تذکرہ تھا۔

اب آتش جوان نہیں ہے..... پھر بھی جانے آج کیسے حسرت جے پوری میرے ذہن کے گوشے میں ابھر آئے ہیں، وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ریڈیو سے ان کا لکھا ہوا گانا آ رہا ہے

بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے

اقبال حسین یعنی حسرت جے پوری گلابی شہر جے پور میں 15 / جنوری

1918ء کو پیدا ہوئے اور 10 ستمبر 1999ء کو ممبئی میں 81 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

اگرچہ تعلیمی لحاظ سے حسرت جے پوری میٹرک پاس بھی نہ تھے لیکن حسرت کو اپنے نانا فدا حسین فدا کی صحبت میں رہ کر اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ فدا صاحب بذات خود اُردو کے مانے ہوئے شاعر تھے۔

حسرت جے پوری دراصل فلم ایکٹر بننے کے لئے ممبئی آئے تھے لیکن جب یہ ممکن نہ ہو سکا تو بس کنڈیکٹر بن گئے پھر وہاں سے کسی کلا تھ مل میں چلے آئے ، جہاں انہوں نے کلچرل پروگرام میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک ایسے ہی پروگرام میں پرتھوی راج کپور سے ملنے کا اتفاق ہوا، اپنے کچھ شعر سنائے جو پرتھوی راج کپور کو پسند آئے۔ پھر ان کی ہی وساطت سے حسرت جے پوری راج کپور سے ملے اور یہ راج کپور ہی تھے جنہوں نے حسرت جے پوری کو فلم برسات (1949) میں بطور نغمہ نگار شامل کیا۔ ان کا لکھا ہوا گیت ''جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے'' بے حد مقبول ہوا۔ وہ آر کے بینر کا ایک حصہ بن گئے اور اپنی آخری سانس تک وابستہ رہے۔ آر کے بینر کے تحت انہوں نے بہت ساری فلموں کے لئے گانے لکھے جیسے شری چار سو بیس، سنگم بوٹ پالش، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، میرا نام جوکر اور رام تیری گنگا میلی۔ حسرت نے آر کے فلمز کے باہر بھی فلموں کے لئے لکھا۔ دل اپنا پریت پرائی، آرزو، سیما، راج ہٹ، سسرال، مسٹر انڈیا، جنگلی، سورج، تیسری قسم، دل ایک مندر، کنیا دان، برہمچاری، جھک گیا آسمان وغیرہ ایسی فلموں میں شامل ہیں۔

مجھے حسرت جے پوری سے ہوئی ایک اور ملاقات یاد آرہی ہے۔ اچھہ بل (اسلام آباد) میں آنجہانی رامانند ساگر اپنی فلم آرزو کی شوٹنگ کر رہے تھے۔ خزاں کا موسم تھا، اچھہ بل باغ میں چنار کے بے شمار درخت ہوا کرتے تھے۔

(شاید اب بھی ہوں گے) چناروں کے پتے زرد رنگ اپنا رہے تھے۔ ساگر صاحب اسی پس منظر میں گیت فلمانا چاہتے تھے۔ وید راہی (جو کہ فلم آرزو میں چیف اسٹنٹ ڈائریکٹر تھے) کے ساتھ کوئی دو گھنٹہ بیٹھنے کے بعد حسرت صاحب نے جو گیت لکھا وہ ساگر صاحب کو بے حد پسند آیا۔ گیت کے بول مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں لیکن اس گیت میں چنار کے زرد پیلے پتوں کا ضرور ذکر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حسرت جے پوری ایک پرخلوص انسان تھے اور ان لوگوں کا اکثر نام لیتے تھے جنہوں نے جدو جہد کے زمانے میں ان کی کسی نہ کسی طرح مدد کی تھی۔

احسان میرے دل پر تمہارا ہے دوستو!

حسرت جے پوری کو 1966 اور 1971ء میں فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ادبی خدمات کے لئے انہیں جوش ملیح آبادی ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ انہیں ڈاکٹر امبیڈکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ قریب قریب آدھی صدی تک فلموں سے وابستہ رہنے کے دوران حسرت جے پوری نے ساڑھے تین سو سے زائد فلموں کے لئے گانے لکھے۔ فلمی نغموں کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ وہ مختلف فلمی اور غیر فلمی جریدوں میں بھی چھپتے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''آبشار غزل'' بھی شائع ہوا ہے۔

❁❁❁

25

بات چیت

نعیم کوثر کا تعلق بھوپال سے ہے۔ ہفت روزہ ''صدائے اُردو'' کے مدیر ہونے کے ساتھ وہ ایک نامور افسانہ نگار بھی ہیں۔ حال ہی میں ان کے دو افسانوی مجموعے ''کالی کوٹھری'' اور خوابوں کے مسیحا'' شائع ہوئے۔ ان کے افسانے لکھنے کا انداز الگ سا ہے وہ اپنے افسانوی کردار زمین کی کھردری سطح سے لیتے ہیں......

وہ اپنے زمانے کے نامور افسانہ نگار کوثر چاند پوری کے فرزند ہیں۔ انہوں نے اپنے والد مرحوم کی ادبی اور علمی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ حاصل کیا ہے!!

کوثر چاندی پوری کی ادبی زندگی 1926ء سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''گداز محبت'' کے عنوان سے امرتسر سے شائع ہونے والے کسی جریدے میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں سدرشن، اعظم کرایوی، ل احمد، پریم چند اور نیاز فتح پوری بھی لکھتے تھے لیکن وہ سب کوثر صاحب سے سینئر تھے۔ کوثر صاحب اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں نیاز فتح پوری ور پریم چند سے کافی متاثر رہے ہیں۔

اپنی زندگی کے آغاز میں انہوں نے شعروشاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا تھا اور بعد میں وہ افسانہ اور ناول کی جانب بھرپور توجہ دینے لگے۔ ان کا ایک شعر قلم بند کرتا ہوں ۔

نہیں معلوم الفت کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں
نگاہیں ان سے ملتی ہیں تو دل ہاتھوں اُچھلتا ہے

اپنی زندگی میں کوثر چاند پوری نے ہزاروں کی تعداد میں کہانیاں لکھی ہیں ور درجن بھر ناول بھی، بچوں کے لئے بھی لکھا، تاریخ کے موضوع پر بھی بہت کچھ

لکھا، ان کی تاریخی کتابوں میں ''اظہار عہد مغلیہ'' اہمیت کی حامل ہے۔ وہ مزاحیہ مضامین بھی لکھتے تھے۔ جی ہاں ادبی لحاظ سے یوں کہہ سکتے ہیں...... ''آل اِن وَن''۔

کوثر چاندپوری اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ انہیں انتقال کئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ آج میں اس مختصر مضمون میں ان کے ادبی خیالات کو آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گا، وہ کہتے ہیں:

> ''ادیب ہونے کے لئے سب سے بڑی خصوصیت خلوص ہے، خلوص کے بغیر کوئی بھی شخص حقیقی ادیب نہیں بن سکتا۔ اپنے مقصد، موضوع، زندگی اور کردار کے ساتھ ادیب کو پوری مخلصانہ وابستگی ہونی چاہیے۔ ویسے فکر و خیال کی بلندی احساس کی شدت اور مطالعہ کائنات کا ذوق بھی ادیب کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔''

کوثر چاندپوری مرحوم کی رائے میں افسانے میں موضوع کو بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سلیقہ سے پیش کرنا بھی ضروری ہے اور اس سلسلہ میں اسلوب بہت حد تک موضوع کا پابند ہو جاتا ہے۔ موضوع اپنا اسلوب خود بناتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلوب کوئی اہم چیز نہیں ہے۔

اپنے دور کے ایک مقبول افسانہ نگار آنجہانی رام لال کے ایک سوال کہ زندگی میں وقتی مسائل اہم ہوتے ہیں، انہیں پیش کرنے یا نہ کرنے میں ادیب کا کیا رول ہونا چاہیے، کے جواب میں مرحوم کوثر چاندپوری نے 1962ء میں کہا تھا:

> ''زندگی میں وقتی مسائل کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ادیب کا فرض ہے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں عوام کی پوری مدد کرے۔ ان کی رہنمائی سے گریز نہ کرے اگر ہنگامی ادب وقت کے ساتھ ساتھ باقی بھی نہ رہے تو کم از کم ادیب کا فرض پورا تو ہو گیا۔ بعض وقتی مسائل تو زیادہ اہم ہوتے ہیں ان سے چشم پوشی کسی طرح مناسب نہیں۔

ادیب بھی اپنے سماج کا معالج ہوتا ہے۔ وہ ہنگامی مسائل کو اپنے
ادب میں پیش کرنے کے لئے مجبور ہے۔ آگے چل کر اس ادب کی
اہمیت باقی رہتی ہے یا نہیں، ادیب اس کے ذریعہ عظیم فن کار بن سکتا
ہے یا نہیں، یہ دیکھنا یا اس پر سوچنا غور و فکر کرنا اس کا کام نہیں۔ اس کا
فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔''

اپنی زندگی میں جن افسانہ نگاروں نے مرحوم کوثر چاند پوری کو متاثر کیا تھا ان میں ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار آنجہانی پریم ناتھ در بھی شامل تھے ان کا خیال تھا کہ در صاحب کے افسانوں میں زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے اُردو افسانے کے بارے میں فرمایا تھا:

''آج کا افسانہ حقیقت کی ایک موثر شکل ہے اور اس میں زندگی کی
مکمل عکاسی اور ترجمانی ملتی ہے، زندگی پر آج افسانہ نگاروں کی
گرفت مضبوط ہے اور وہ انسان کے مسرتوں کا متلاشی ہے......!!!''

✿✿✿

(26)

پرامن نغموں کا خالق......محروم

اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے دستخط سے جموں سے مجھے ماہنامہ ''پگڈنڈی'' (امرتسر) کا محروم نمبر (آثار محروم) بھجوایا تھا۔ یہ 5/جون 2004ء کی بات ہے۔ ''پگڈنڈی'' کا محروم نمبر پہلی بار 1969ء میں شائع ہوا تھا۔ اسکے تین اور ایڈیشن 1978ء، 1979ء اور 2003ء میں شائع ہوئے۔ چوتھا پاکستانی ایڈیشن ہے اور اسے مکتبہ علم و دانش لاہور (پاکستان) نے شائع کیا ہے۔ مجھے جو نمبر ملا وہ بھی پاکستانی ایڈیشن تھا۔ اس نمبر کے ترتیب کار امریک آنند ہیں۔

پنڈت تلوک چند محروم پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے والد محترم تھے۔

میری نظر میں آثار محروم ایک تاریخی دستاویز ہے اور اس کا ہر مضمون ایک ادبی اثاثہ ہے۔ یہ جامع دستاویز محروم کی حیات اور شخصیت ان کی شاعری، فکر و عمل، وطن سے ان کی محبت سیاست سے ان کی دلچسپی اور انسان دوستی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں جو خطوط پڑھنے کو ملتے ہیں ان سے محروم کی بلند قامت ادبی شخصیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ تقریبات اور اقتباسات الگ سے ان کی ادبی اور علمی زندگی کے کئی پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آنجہانی محروم نے جو گراں قدر ادبی کام انجام دیئے ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا وہ خط قلم بند کر رہا ہوں جو انہوں نے محروم کو جنوری 1909ء میں لکھا تھا۔

مکرم بندہ جناب تلوک چند محروم

آپ کا سلام و پیام رسالہ ''مخزن'' میں میری نظر سے گذرا جس میں حسن ظن کا اظہار اشعار میں کیا ہے۔ اس کے لئے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ میں آپ کی نظمیں مخزن میں پڑھتا رہتا ہون، ماشاء اللہ خوب طبیعت پائی ہے، مجھے یقین ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں تمام شعر کہنے والوں میں آپ کا نمبر اوّل ہوگا۔ افسوس کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں۔

محمد اقبال

بیرسٹر لاہور

تلوک چند محروم 1887ء میں پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے تحصیل عیسیٰ خلیل کے گاؤں نور زمان شاہ میں پیدا ہوئے (اب یہ علاقہ پاکستان میں ہے)۔ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ اردو شاعری و ادب کے لئے بنجر تھا لیکن محروم نے اس بنجر علاقے میں شاعرانہ مزاج پایا اور شاعری کے میدان میں صف اوّل کے شاعروں میں جگہ پائی ؎

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے
سحر ہے شمع کہاں اب، کہاں ہیں ویرانے

شاذ تمکنت کہتے ہیں:

''حالی کی آواز پر آواز دینے والے شاعروں میں حضرت محروم بھی ہیں جن کی شاعری کا خمیر اصلاح پسندی، اخوت، حب الوطنی اور انسان دوستی سے اُٹھا ہے۔''

تاجور ساحری کا کہنا ہے کہ محروم صاحب انسان کے اچھے مستقبل کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ اس کے محافظوں میں سے بھی ہیں، ان کی پر امید اور امن پرور نغمے عوام کے سہمے ہوئے دلوں اور خوف سے مکدر ذہنوں کو روشنی بخشتے رہیں گے۔

آثار محروم کو کئی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ فہرست یوں ہے:

''پیغامات اور مقالات''، ''منظومات اور مکتوبات''، ''تقریبات''
''اقتباسات''اور''سپاس نامے''

پگڈنڈی کے آثار محروم نمبر 540 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

محروم صاحب فارسی زبان میں بھی شعر کہتے تھے اگر چہ ان کے فارسی کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ فارسی کلام میں ان کے قطعات پُر لطف ہیں، بقول سید رفعت فارسی میں ان کی غزلیں پاکیزہ نوعیت کی ہیں اور اس طرح انہوں نے نہایت آسان زبان میں بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم　　ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھادے　　جس سے ملے سعادت اس راہ پر ملادے

سر عبد القادر تلوک چند محروم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک چیز جو اُن کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے وہ کیفیت غم ہے،
بہار ہو یا خزاں قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر ان کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے

وہ ہی گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
نمود شام سے پہلے جگر کے داغ جلے

تلوک چند محروم کی پہلی شعری تخلیق کلام محروم (حصہ اول) 1951ء میں شائع ہوئی۔ 1920ء میں کلام محروم کا دوسرا حصہ شائع ہوا اور 1923ء میں تیسرا حصہ۔ ''گنج معانی'' 1932ء میں شائع ہوا اور ''کاروان وطن''1960ء میں ''نیرنگ خیال''1963ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُن کی باقی تصنیفات یوں ہیں: شعلہ نوا۔ 1960ء اس کے تین حصے ہیں۔ بہار فصل۔ بچوں کے لئے (1960)، بچوں کی دنیا (1964)۔ محروم صاحب نے گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو شاید شائع نہ ہوسکا۔ تلوک چند محروم ایک فرد کا نام نہیں اب یہ نام ایک ادبی روایت بن چکا ہے۔ ایک جاندار ادبی روایت......!۔

کشمیر کا شیدائی

منشی محمد الدین فوق کاشمیری فروری 1877ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور وہ اس تعلق سے کشمیری تھے کہ ان کا پڑدادا حسن ڈار کشمیر کے علاقہ کا فراز سے ترکِ وطن کر کے سیالکوٹ چلے گئے تھے اور بقول فوق مرحوم یہ ہجرت 1816ء میں ہوئی تھی۔ حسن ڈار کے دو بیٹے تھے، رجب ڈار اور اللہ دتا۔ رجب ڈار کی چھ اولادیں تھیں، تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ تین بیٹوں میں ایک بیٹا شاعر تھا اور ان کا نام لدھا خان تھا، زار ان کا تخلص تھا، لدھا خان زار۔ محمد الدین فوق ان کے ہی بیٹے تھے۔ لدھا خان اپنی ملازمت کی وجہ سے کبھی سیالکوٹ کبھی جموں اور کبھی پونچھ میں قیام کرتے تھے۔ اس وجہ سے فوق صاحب اپنے چاچا بوڑھا خان کے ہاں سیالکوٹ میں رہتے تھے۔ لدھا خان نے بعد میں مستقل طور پر پونچھ میں ملازمت اختیار کر لی اور اس طرح سے ریاست جموں و کشمیر سے ان کا رشتہ قائم و دائم رہا۔

منشی محمد الدین فوق نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر سیالکوٹ کے مڈل سکول میں داخلہ لیا۔ فوق صاحب کے والد اپنے بیٹے کو پٹواری بنانا چاہتے تھے وہ انہیں جموں لے آئے لیکن یہاں گورنر دیوان امرناتھ جی نے انہیں 1894ء میں محکمہ پرمٹ میں ملازمت دی۔ یہ ملازمت انہیں راس نہ آئی اور وہ لاہور چلے گئے۔ لاہور جا کر پیسہ نامی اخبار میں ملازمت اختیار کی، یہاں کام کرتے کرتے انہیں صحافت میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی، پھر اخبار کوہِ نور کی دارت سنبھال لی۔ ان اخباروں میں وہ قریب قریب چار سال تک کام کرتے

رہے۔ 1901ء میں اپنے اخبار کی اشاعت شروع کی، اخبار کا نام تھا ''پنجہ فولاد''......!!

فوقؔ شاعری میں داغ مرحوم کے شاگرد تھے، جب داغؔ مرحوم نے اخبار پنجہ فولاد دیکھا تو کہا ؎

ہوا ہے پنجہ فولاد جاری
خریدارو نیا اخبار دیکھو
جناب فوق کی گلکاریوں سے
نیا اخبار یہ گلزار دیکھو

اخبار پنجہ فولاد 1906ء میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیری میگزین کے نام سے ایک ماہنامہ کی اشاعت شروع کی جس میں اہلِ کشمیر اور کشمیر کے بارے میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ 1913ء میں یہ ماہنامہ ہفتہ وار ہوگیا اور اخبار کا نام ''کشمیری'' رکھا گیا۔ ''کشمیری'' اب واقعی کشمیریوں کا ترجمان بن گیا تھا۔ فوق کی بے حد اور ان تھک کوششوں کی وجہ سے کشمیر کے اندرونی حالات اخبار کشمیری کے ذریعہ عام لوگوں تک پہنچنا شروع ہوگئے۔ کشمیر سے باہر اخبار کشمیری پڑھنے والوں کو کشمیری عوام اور ان کی مشکلات سے جانکاری ملتی رہی۔ وہ کشمیر کے بارے میں متحرک ہوگئے، اخبار کشمیری کی یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ فوق صاحب نے ایک ادبی رسالہ ''تصوف'' شروع کیا لیکن یہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ اخبار ''کشمیری'' 1933ء تک فوق کے زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔ پھر اس کی ادارت رشید صحرائی نے سنبھالی لیکن وہ اخبار کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح کشمیری عوام کا یہ ترجمان ...... اخبار ''کشمیری'' ...... بند ہوگیا لیکن اس دوران فوق مرحوم نے اپنے اخبار اور اپنے جریدے کے ذریعہ کشمیری عوام کی جو خدمت کی وہ قابل قدر ہے!

مرحوم انوار احمد صاحب نے فوق مرحوم پر بہت تحقیقاتی کام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فوق صاحب نے غزلیں کم اور نظمیں زیادہ کہی ہیں اور اکثر نظموں میں

کشمیر اور کشمیر کے حالات کا ضرور ذکر ہے۔ کشمیر کی سندرتا کا تذکرہ ہے۔ ان نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فوق صاحب نے ہر نظم سے پہلے نظم کی شانِ نزول کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ 1924ء میں ریشم خانہ سرینگر کے مزدوروں پر جو ظلم ہوئے ان کا ذکر فوق صاحب اپنی نظم کے آغاز میں یوں کرتے ہیں۔

> ''22 جولائی 1924ء کی صبح کو ریشم خانہ سرینگر کے ہزار ہا مزدور پر جو حضوری باغ میں جمع ہو کر 25 سرکردہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے، فوج نے حملہ کر دیا اور بے شمار لوگ نیزوں، نوکوں اور گھوڑوں کے ٹاپو اور ڈنڈا کی ضرب سے زخمی ہوئے۔''

خوشی محمد ناظر فوق مرحوم کے ہمعصر تھے اور اس زمانے کے اچھے شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مرحوم ناظر حالی صاحب کے شاگرد تھے اور سر سید احمد خان کی تحریک سے وابستہ تھے۔ فوق صاحب نے اپنی ایک نظم ''مناظر کشمیر کی یاد'' میں ناظر کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

ایک ناظر ہی نہیں شامل ترے کشتوں میں ہے
فوق بھی تیرے نگاہِ ناز کے کشتوں میں ہے

منشی محمد فوق کی تصانیف کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں سے تاریخ اقوام کشمیر، شباب کشمیر، مکمل تاریخِ کشمیر، خواتین کشمیر، تاریخ اقوامِ پونچھ، تحریک حریت اسلام، لاہور عہد مغلیہ میں اور روایات اسلام کے مطالعہ سے فوق صاحب کی علمی، ادبی اور تاریخی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

منشی محمد الدین فوق 14 ستمبر 1945ء کو انتقال کر گئے۔

✿✿✿

28

موسیقی ایک سمندر ہے

برصغیر کے معروف، مقبول اور ممتاز موسیقار اُستاد بسم اللہ خان کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنی شہنائی کے علاوہ شہر بنارس سے بے حد لگاؤ تھا، جہاں تک شہنائی کا تعلق ہے اس میں انہوں نے نئی نئی ترمیمیں کیں اور ایسی باریکیاں پیدا کیں کہ شہنائی وادن کو بے حد عروج حاصل ہوا۔ شہر بنارس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ شہر دو لفظوں پر مشتمل ہے۔ بنا اور رس!! کہتے ہیں کہ جب تقسیم وطن کے وقت کسی نے اُن سے پوچھا...... ''آپ پاکستان کیوں نہیں گئے؟...... اُنہوں نے جواب میں کہا تھا:

''بنارس چھوڑ کہاں جاؤں گا''

بنارس اُن کے لئے شہر آرزو تھا۔ بنارس والوں کو بھی اُن سے محبت تھی، اُن کا احترام تھا، جب 22 / اگست 2006ء کو انہوں نے آخرت کیلئے رخت سفر باندھا تو پورا بنارس انہیں وداع کرنے کیلئے موجود تھا۔

کسی زمانے میں شہنائی شادی کے موقعوں پر بجانے والا ایک ساز تصور کیا جاتا تھا۔ استاد بسم اللہ خان نے اس ساز کو کلاسیکی موسیقی میں ایک نیا، جدید اور ممتاز مقام عطا کیا۔ اب شہنائی استاد بسم اللہ کے بغیر اور خود استادِ محترم شہنائی کے بغیر نامکمل نظر آتے ہیں۔

خان صاحب 21 / مارچ 1916ء کو دامروں نامی گاؤں ضلع بکسر بہار میں پیدا ہوئے۔ خان صاحب کے ماموں علی بخش ولایتی بنارس میں قیام پذیر تھے اور بنارس میں وشوناتھ مندر سے وابستہ تھے جہاں وہ شہنائی بجاتے تھے، خان

صاحب چھ برس کی عمر میں اپنے ماموں کے پاس بنارس آئے اور پھر ساری عمر یہیں قیام کیا۔ 1930ء میں موسیقی کے سمندر میں ڈوب گئے اور پھر ایک موسیقار کی حیثیت میں دنیا کے کونے کونے کا سفر کیا اور پوری دنیا میں موسیقی سے دلچسپی یا رغبت رکھنے والوں کو اپنا ہم سفر بنایا......!!

جب ملک آزاد ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے تاریخی لال قلعہ میں پہلی بار آزادی کا پرچم لہرایا تو استاد بسم اللہ خان نے 15/اگست 1947ء کو لال قلعہ کی فصیل سے شہنائی بجائی تھی لیکن اُن کی دو خواہشیں زندگی بھر پوری نہ ہو سکیں۔ وہ انڈیا گیٹ نئی دہلی پر ایک پروگرام پیش کرنا چاہتے تھے، اس کیلئے 9/اگست 2006ء کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی لیکن علالت کی وجہ سے اس پروگرام میں اُن کی شرکت ممکن نہ ہو سکی۔ وہ اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرنے کیلئے دربھنگہ شہر میں ایک پروگرام میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ جب اٹل بہاری واجپائی وزیر اعظم تھے تو خان صاحب نے پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک پروگرام پیش کیا تھا جو براہِ راست نشر ہوا تھا۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام اس پروگرام کے مہمانِ خصوصی تھے۔

استاد بسم اللہ خان اتنی شہرت اور عظمت کے باوجود مالی طور پر ہمیشہ کمزور رہے، وہ سادگی کے قائل تھے، شرافت کا پیکر تھے، شرافت اور سادگی اُن کی زندگی کی بنیاد تھی، وہ ایک بوسیدہ حویلی میں رہتے تھے اور بنارس کی گلیوں میں رکشا میں گھومتے تھے۔ سید امتیاز الدین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''خان صاحب کے پانچ بیٹے، تین بیٹیاں اور کئی نواسے، پوتے پوتیاں تھیں۔ ان کا گھر 66 افراد کا آشیانہ تھا۔ کئی بے سہارا لوگ دو وقت کی روٹی کیلئے خان صاحب کے گھر آجاتے تھے، ان کے گھر کے اپنے لوگ پیار سے اپنے ہی گھر کو ''بسم اللہ ہوٹل'' بھی کہتے تھے۔''

ان کی موت سے نہ صرف بسم اللہ ہوٹل کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا بلکہ موسیقی کے ایک بیش بہا خزانے کا دروازہ بھی بند ہو گیا......!!

بسم اللہ خان کے وجود میں انسانی ہمدردی کا جو جذبہ پوشیدہ تھا اُس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کی ایک معروف کمپنی اُن کا احترام کرتے ہوئے اُن کے گھر کے ایک کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگانا چاہتی تھی لیکن خان صاحب نے انکار کیا اور کہا:

"یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنی راتیں ایئر کنڈیشنر کی ٹھنڈک میں گزاروں اور میرا پڑوسی اپنی ٹین کی چھت پر پانی چھڑک چھڑک کر گرمی برداشت کرنے کی کوشش میں رات کاٹے!"

استاد بسم اللہ خان کو پدم شری، پدم بھوشن اور بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اپنے ملک میں ایسی شخصیات کی تعداد بہت کم ہے جنہیں زندگی میں تین تین اعلیٰ اعزازات سے نوازا گیا ہو۔ شانتی نکیتن اور بنارس ہندو یونیورسٹی نے بھی خان صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کی تھیں۔ اس کے باوجود یہ شہنائی نواز فقیر، فقیرانہ زندگی ہی بسر کرتا رہا۔ 91 برس کی عمر میں انتقال کیا لیکن اُن کا فن شہنائی کی آواز میں، شہنائی کے روپ میں آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کی شہنائی کی دھن آج بھی رواں دواں ہے!

مرحوم استاد بسم اللہ خان اکثر کہا کرتے تھے:

"موسیقی ایک سمندر ہے اور میں اس کے کنارے پر کھڑا ہوں......"

یہ اُن کی انکساری کا ایک پہلو ہے......!!!

❁❁❁

29

قفس اُداس ہے

کشمیر عظمیٰ میں یہ خبر پڑھ کر مسرت ہوئی کہ اپنے دور کی معروف، منفرد اور خوبصورت ترین فلم اداکارہ مدھو بالا کی یاد میں ممبئی میں محکمہ ڈاک نے ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے، اس موقع پر انڈین پوسٹل سروس کے مرکزی سکریٹری ایچ جی خان بھی بطور مہمانِ خصوصی موجود تھے۔ اب کی بار پانچ روپے کی ٹکٹ پر مدھو بالا ہنستی مسکراتی اور اپنی پوری خوبصورتی اور سندرتا کے ساتھ نظر آتی ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مدھو بالا اب ہمارے درمیان نہیں......!!

14 ر فروری پوری دنیا میں ''ویلنٹائین ڈے'' کے طور پر منایا جاتا ہے، اسی یومِ محبت پر مدھو بالا 1933ء میں دلی میں پیدا ہوئی تھی اور صرف 36 سال کی عمر گذارنے کے بعد 23 ر فروری 1969ء کو اپنی پوری مسکراہٹوں اور دلفریب اداؤں کے ساتھ ہمیشہ کیلئے روپوش ہو گئیں، بھلا یہ بھی کوئی مرنے کی عمر ہے لیکن مرنا جینا تو کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ اب ممبئی کے شانتا کروز قبرستان میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

اپنی فلمی زندگی کے مختصر سے سفر میں مدھو بالا نے تقریباً 70 فلموں میں کام کیا اُس نے ایک چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی فلمی کیئریر کا آغاز کیا تھا۔ یہ 1942ء کی بات ہے یعنی اُس وقت مدھو بالا صرف نو سال کی تھی۔ فلم تھی بسنت، فلم کی ہیروئن ممتاز شانتی تھی، دلیپ کمار نے بھی اس فلم میں کام کیا ہے۔

مدھو بالا نے ممتاز شانتی کی بیٹی کا رول نبھایا تھا۔ اُس وقت کسے معلوم تھا کہ آگے چل کر وہ دلیپ کمار کی ہیروئن بنے گی، نہ صرف پردۂ سکرین پر بلکہ دل کے

سکرین پر بھی۔ فلمی دنیا اور فلموں سے ذراسی دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دلیپ کمار اور مدھو بالا کی جوڑی ایک مثال بن گئی تھی اور فلم کی کامیابی کی ضمانت بھی۔ جب فلم جوار بھاٹا بن رہی تھی تو دونوں کے دل بھی ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے حالانکہ اُس زمانے میں بھی دلیپ کمار مدھو بالا کی عمر کے تعلق سے کئی سال بڑے تھے جن قارئین کو دلیپ صاحب کی تاریخ پیدائش یاد ہوگی وہ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اُن دونوں کا ملنا اللہ کو منظور نہ تھا۔ ظاہری طور پر مدھو بالا کا باپ عطاءاللہ خان بھی ان دونوں کی شادی کے خلاف تھا، وہ دونوں کی محبت کے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑا ہو گیا، دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں، مدھو بالا نے کشور کمار کو اپنا لیا، اُس نے اپنا بدن کشور کمار کو دے تو دیا لیکن شاید اپنی محبت نہ دے سکی، یہاں بھی ایک دیوار اُن دونوں کے درمیان حائل تھی، یہ دیورا مذہب کی تھی، کشور کمار ہندو تھا اور مدھو بالا مسلمان (اصل نام ممتاز بیگم جہاں) مدھو بالا بیمار رہنے لگی (دل کی بیماری؟!) کشور کمار نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا، اُس کے لئے بہتر سے بہتر علاج ومعالجہ کا انتظام کیا کشور کمار سے عبداللہ بھی بن گیا لیکن کسی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ مدھو بالا نے اپنی اداسیوں پر دلفریب مسکراہٹ کی چادر ڈال رکھی ہے، دل میں ایک زخم تھا، ایک گہرا زخم اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک اس زخم کا مرہم تلاش کرتی رہی مگر زخم بھر نہ سکا، اس کی موت انارکلی کی موت تھی، ایک عہد کی موت تھی، ایک ایسی اداکارہ کی موت تھی جس کے سحر میں ایک دنیا قید تھی......!

اور جب دلیپ کمار کو مدھو بالا کی موت کی خبر ملی تو وہ زاروقطار روتے رہے!!

مغل اعظم تو خیر اپنے دور کی ایک عظیم فلم تھی ہی اُس کی عظمت آج بھی قائم ودائم ہے، مدھو بالا نے فلم امر اور ترانہ میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا، مدھو بالا کے اندر جو ادکارانہ حسن تھا اُس سے متاثر ہو کر کیدار شرما نے مدھو بالا کو اپنی فلم

نیل کمل میں راج کپور کے مقابل ہیروئن کے طور پر پیش کیا۔ 1949ء میں بنی فلم ''محل'' ایک الگ نوعیت کی فلم تھی، اس کا گانا ''آئے گا آنے والا'' آج بھی مقبول ہے۔ مدھو بالا کی دوسری اہم فلمیں ہیں...... ممتاز محل، نقاب، پجاری، مسٹر اینڈ مسز 55، کالا پانی، ہاوڑہ برج، چلتی کا نام گاڑی، برسات کی رات، امر پریم، دلاری، بادل، ڈوپٹہ وغیرہ...... اِن فلموں میں اپنے زمانے کے مشہور فلم اداکاروں نے کام کیا۔ دلیپ کمار کے علاوہ، اشوک کمار، راج کپور، رحمان، پردیپ کمار، دیو آنند، شمی کپور، بھارت بھوشن، پریم ناتھ اور سنیل دت کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس حسن کی دیوی نے محبوب خان، کمال امروہی، کے آصف اور گرودت جیسے معروف ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔

مدھو بالا حسن کی ایک علامت تھی اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی آسمانی اپسرا ہے یا دیو مالائی حسن کا پیکر۔ جو بھی اُسے دیکھتا اُس کے رنگ و روپ میں ڈوب جاتا۔ تھیٹر آرٹس میگزین نے اپنی ایک اسٹوری میں مدھو بالا کے بارے میں لکھا تھا:

''دنیا کی سب سے بڑی اداکارہ......''

یہ مختصر سا جملہ مدھو بالا کی اداکارانہ صلاحیتوں کا عالمی سطح پر عکاسی کرتا ہے، اپنی مقناطیسی کشش کے لئے اُسے ''مارلن منرو'' بھی کہا جاتا تھا۔

فلم مغل اعظم نے فلمی دنیا کی تقدیر تو بدل ڈالی لیکن اُسے مدھو بالا کو سب سے زیادہ شہرت ملی، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ انارکلی بار بار پیدا ہوسکتی ہے لیکن مدھو بالا نہیں......!!

✿✿✿

30

سُر اور سنگیت کا بادشاہ

20 راپریل 2006ء کو عظیم موسیقار نوشاد علی 87 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ نوشاد صاحب اپنے ہم عصر عہد ساز موسیقاروں کی آخری یادگار تھے۔ وہ علمی، ادبی اور تہذیبی قدروں کے شہر لکھنو کے قیصر باغ علاقے میں 25 ردسمبر 1915ء کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام حامد علی تھا۔ نوشاد لکھنو میں ہی پلے، بڑھے اور اسی شہر میں ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ وہ گھریلو مشکلات کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور اپنے ماموں کی سازوں کی دکان پر کام کرنے لگے۔ اُنہیں ہارمیونیم کی مرمت کا کام سونپا گیا۔ خدا کو اُن کے لئے کچھ اور ہی منظور تھا اور شاید اسی لئے سازوں کی مرمت کرتے کرتے اُن کے اندر موسیقی کی لگن پیدا ہوگئی اور ان کی انگلیاں خود بخود ہارمونیم سے ہم آہنگ ہونے لگیں۔ اس دوران انہیں استاد غربت علی، استاد یوسف علی اور استاد ببین صاحب کی شاگردی میں رہنے کا موقع ملا اور 1937ء میں خاموشی کے ساتھ ممبئی چلے آئے۔ ممبئی میں انہیں بھوکا رہنا پڑا، سڑکوں پر سونا پڑا لیکن اُنہوں نے ہمت نہ ہاری اور ایک روز وہ موسیقار مشتاق حسین کے سازندوں میں شامل ہو کر پیانو پر اپنی انگلیاں اڑانے لگے۔ پھر کھیم چندر پرکاش کے معاون بنے۔ پہلے وہ اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر کام کرنے لگے لیکن 1940ء میں آزادانہ طور پر فلم پریم نگر میں موسیقی دینے کا موقع ملا۔ 1942ء میں اُنہوں نے فلم شاردا کے لئے ثریا کی آواز کا استعمال کیا۔ اُس وقت ثریا صرف 13 برس کی تھی۔ نوشاد صاحب نے محمد رفیع اور لتا منگیشکر کو بھی فلموں کے لئے گانے کے مواقع

فراہم کئے۔ اُنکی آواز کونکھارنے میں نوشاد صاحب کا بڑا حصہ رہا ہے۔ محبوب خان کی فلم ''انداز'' کے ایک گانے کیلئے اُنہوں نے لتا جی سے 20 روز تک ریہرسل کروائی۔ محمد رفیع اور لتا جی کے بعض شاہکار فلموں کی دھنیں نوشاد صاحب کی بنائی ہوئی ہیں۔ اسی طرح آشا بھونسلے، شمشاد بیگم، مہیندر کپور اور اوما دیوی کو بھی نوشاد صاحب نے متعارف کرایا۔ ان کی موسیقی میں سہگل، درانی، میکش، ہمنت کمار، مناڈے، نور جہاں، امیر بائی، زہرہ بائی اور مبارک بیگم نے کیسے کیسے دل کو چھو لینے والے گیت پیش کئے، یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی مقبولیت میں نوشاد علی کے Contribution کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

نوشاد صاحب نے 62 سال فلمی دنیا میں گذارنے کے باوجود صرف 68 فلموں میں موسیقی دی جن میں سے 3 ڈائمنڈ جوبلی، 9 گولڈن جوبلی اور 26 سلور جوبلی ہیں پھر بھی وہ ہمیشہ اپنی موسیقی میں مزید Perfection اور نکھار لانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

نوشاد علی نے کسی بھی دور میں اپنی موسیقی کی تبدیلی کے لئے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اُنہوں نے کلاسیکی موسیقی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ اس لئے اُن کے گیت امر ہو گئے، بہتر سے بہتر گیت اُن کی موسیقی سے سج سنور کر نکلتے رہے اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھوتے رہے۔ نوشاد علی نے موسیقی میں نئے نئے تجربات کئے۔ اُنہوں نے کلاسیکی طرز کو جدید، آسان اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ مغربی سازوں کو ستار اور بانسری کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ اُن کی موسیقی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اُن کے اکثر نغمے یک لخت مقبول نہیں ہوتے تھے بلکہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لئے دل نشین ہو جاتے تھے۔

نوشاد علی کو 1953ء میں فلم بیجو باورا کے لئے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ 1982ء میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1984ء میں لتا منگیشکر ایوارڈ ملا۔ 1987ء میں امیر خسرو اعزاز دیا گیا اور پھر 1992ء میں انہیں ''پدم بھوشن'' کا خطاب ملا۔ شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچنے کے بعد بھی بالکل نہیں بدلے

۔اُنہیں جب کوئی ایوارڈ ملتا تو اپنے نرم لہجے میں کہتے ''عوام کا پیار میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے، عوام نے مجھے عزت بخشی، میری موسیقی کو عزت بخشی، یہ میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے......''

انمول گھڑی، شاہ جہاں، انوکھی ادا، اعلان، درد، میلہ، انداز، دل لگی، دالاری، بابل، دیدار، بیجو باورا، شباب، اڑن کھٹولہ، مدرانڈیا، سوہنی مہیوال، مغل اعظم، گنگا جمنا، میرے محبوب، دل دیا درد لیا اور پائل وغیرہ اُن کے کامیاب فلموں میں سے چند ایک ہیں۔ نوشاد صاحب ایک عظیم اور قابلِ احترام موسیقار ہی نہیں بلکہ ایک شاعر، ادیب اور گیت کار بھی تھے۔ اُن کی شعری تخلیق کا نام ''آٹھواں سر'' تھا۔ اُنہوں نے شباب، اڑن کھٹولہ، میلہ، بابل، دیدار، پالکی اور ساز و آواز نامی فلموں کی کہانیاں بھی تحریر کی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی فلمی زندگی کے دوران دو فلمیں جادو اور داستان کے نام سے پروڈیوس کی تھیں۔ اُن کی یاداشتیں پڑھ کی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اصول پسند، مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔

نوشاد علی اردو تہذیب کے بہترین نمائندہ تھے۔ وہ اپنی بات چیت اور روزمرہ کے دیگر مشاغل میں ہر جگہ اُردو کا استعمال کرتے تھے۔ وہ ہندوستانی موسیقی کے سالارِ کارواں تھے۔ وہ اکثر محفلوں میں اپنے یہ اشعار ضرور سناتے تھے۔

منزل مجھے ملے نہ ملے اِس کا غم نہیں
منزل کی جستجو میں مرا کارواں تو ہے
آبادیوں میں دشت کا منظر بھی آئے گا
گزرو گے شہر سے تو میرا گھر بھی آئے گا

موسیقی کے شہنشاہ نوشاد علی اب ہمارے درمیان نہیں، اُن کے جانے سے کلاسیکی موسیقی کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ سُر اور سنگیت کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ مٹھاس، نغمگی اور تازگی ختم ہوگئی جو اُن کی موسیقی کی دین تھی۔

نوشاد جیسے موسیقار اور فنکار صدیوں میں بھی پیدا نہیں ہوتے۔

موت برحق ہے دنیا فانی ہے		چار دن کی یہ زندگانی ہے

❁❁❁

31

نادم اور نعتیہ شاعری

عبدالاحد نادم کی شاعری کا میدان نعت ہے۔ ان کی شاعری کی ابتدا نعت سے ہوئی اور انجام بھی اسی پر ہوا اور ان نعتوں میں نادم صاحب نے نہایت ہی عام فہم اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ ایک ایسی زبان جو ہر کشمیری بول سکتا ہے، سن سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے (اور لکھ بھی سکتا ہے)۔ ان کا نعتیہ کلام پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے روانی کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ میر غلام رسول نازکی لکھتے ہیں کہ مرحوم نادم کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

نعت

مناجات اور شہر آشوب!!

وہ لکھتے ہیں کہ مناجات نادم صاحب نے ایک لکھی ہے، نعت میں ایک سو پچاس کے قریب نعتیں ہیں، پھر ایک شمائل نبویؐ ہے، شہر آشوب میں اپنے زمانے کے حالات لکھے ہیں اور اپنے سماج کا ایک طرح سے بھرپور پوسٹ مارٹم کیا ہے۔

نادم کی شاعری کی ابتداء اس وقت ہوئی جب وہ تیرہ سال کی عمر کے تھے، ایک دن ان کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں اور وہ ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھے درد کی شدت سے بے قرار تھے، پڑوس میں کسی کے ہاں شادی تھی اور عورتیں ''ونہ ؤن'' گا رہی تھیں، یہ ونہ ون سن کر نادم مرحوم کا دل کافی متاثر ہوا اور انھوں نے ایک نعت لکھی اور اسی لَے میں لکھی جس میں ونہ ون گایا جاتا ہے، شاید عورتوں کی دلکش اور پُرکشش آواز کی قوت کا ان کو احساس تھا، وہ اس بات سے باخبر تھے کہ اگر عورت

کی اس آواز کو صحیح راہ پر رکھا جائے تو وہ قوم کی تقدیر بن سکتی ہے، شادی بیاہ کی تقریبوں پر ونہ وُن کے انداز میں نعت گا کر عشقِ رسول ﷺ کا تابناک ماحول پیدا کر سکتی ہیں۔

سیکھیو آوٗ، کلمہ طیبہ کے منبع سے نکلتے ہوئے علم کے چشمے پر جائیں جہاں اپنے گھڑوں میں پانی بھر لیں (اسے پئیں اور پلائیں) اس پانی سے رسول ﷺ کی ساری امت رہتی دنیا تک سیراب رہے گی...... آوٗ سیکھو، رسول ﷺ پر زیادہ درود بھیجیں!!!

بے زبانن یہ عشق بے جانن
واتہ کیاہ آدمی مسلمانن

عشق رسول ﷺ کے معاملے میں یہ حال بے زبانوں اور بے جانوں کا ہے اس لئے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ایک مسلمان پر عشق محمدی ﷺ کے سلسلے میں کیا لازم آتا ہے۔

عبدالاحد نادم 1258 ہجری میں پیدا ہوئے اور 1329 ہجری میں انتقال کر گئے۔ اس لحاظ سے وہ 71 برس زندہ رہے، جن لوگوں نے نادم مرحوم کو دیکھا ہے اُن کا کہنا ہے کہ کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں وہ بڑے نفاست پرست تھے۔ عام طور پر سبز رنگ کا عمامہ پہنتے تھے اور کپڑے سفید براق ہوتے، مریضوں کو دیکھنے کسی دور جگہ جاتے تو اپنے لئے کھانا ساتھ لے جاتے تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ دن کے اکثر حصے میں خلق خدا کا کام کرتے تھے اور رات کو اکثر بیدار رہتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام غلام محی الدین تھا، پیشہ کتابت تھا۔ وہ سرینگر کے علاوہ رعناواری میں رہتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی بیوی اپنے بھائیوں کے پاس گامرو بانڈی پورہ چلی آئی، نادم بھی ساتھ تھے، انہوں نے اسی گھر میں اسی ماحول میں پرورش پائی، یہ ایک اعلیٰ علمی گھرانہ تھا لہٰذا شعر وشاعری کی طرف ان کی توجہ ہوئی اور ان کے دل میں عشق نبوی ﷺ کا پرتو پڑا۔

عبدالاحد نادم پر میر غلام رسول نازکی نے اپنی ترتیب دی ہوئی کتاب میں اُن کی نعتیہ شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتابچہ ریاستی کلچر اکادمی نے 1961ء میں شائع کیا ہے۔ نازکی صاحب نے نادم کے کلام کے انتخاب کو بھی پیش کیا ہے، قابل تعریف بات یہ ہے کہ نازکی صاحب نے نادم صاحب کے کشمیری نعتیہ کلام کو اُردو کا روپ دیا ہے اور اس طرح سے کشمیری زبان وادب کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے، ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

شہر آشوب سے:

سادات کو غرور اور نخوت نے برباد کر دیا ہے۔ ان کے عادات واطوار سب سے بڑے ہیں ان کے کردار میں صحیح خلعت ایک بھی نہیں ہے، ہمارے اعمال وہ ہیں جو کبھی کافروں کے لئے باعث تنگ تھے۔

ایک نعتیہ شعر اور اس کا نثری ترجمہ:

یس نہ آسی تہند محبت پور

سہ تمس نش چھ دور نا منظور

جس کے دل میں حضور ﷺ کی پوری محبت نہیں وہ حضور سے دور اور ان کے دربار سے مردود اور نا منظور آدمی ہے۔

عبدالاحد نادم اپنی نعتیہ شاعری کے پس منظر میں کشمیری زبان وادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

❁❁❁

32

علم و آگہی کا رسیا......ساقیؔ

جب نور محمد صاحب اگریکلچر پروڈکشن کمشنر تھے تو وہ کبھی کبھار موتی لال ساقیؔ کا ذکر چھیڑتے تھے۔ ساقیؔ صاحب کسی زمانے میں محکمہ دیہات سدھار سے منسلک تھے اور دیہات سدھار اگریکلچر منسٹری کی ایک اہم ونگ ہوا کرتی تھی۔ کچھ اس ناطے سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ نور صاحب کو خود کشمیری زبان و ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ نور صاحب کشمیری زبان میں شعر کہتے ہیں، شروع شروع میں اس بات سے بہت کم لوگ واقف تھے لیکن جب وہ بحیثیت چیف سیکریٹری سبکدوش ہوئے تو انہوں نے اپنی الوداعی پارٹی میں اس بات کا انکشاف کر کے حاضرین کو حیران کر دیا۔ خیر یہ تو بات سے بات نکل آئی۔ میرے من میں بھی ساقیؔ سے ملنے کی خواہش ابھری اور جب میں ان سے ملا تو مجھے لگا جیسے ان کے وجود میں کشمیری علم و ادب کا ایک سمندر چھپا ہو۔ وہ ایک قلم کار تھے، اگر چہ وہ کشمیری زبان میں لکھتے تھے لیکن انہیں اُردو زبان پر بھی دسترس حاصل تھی، وہ ہندی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے، انہوں نے اپنے کئی مضامین اُردو میں بھی لکھے ہیں۔ یہ مضامین (اُردو یا کشمیری) ادبی اور تاریخی نوعیت کے ہیں۔ مختلف شخصیات پر بھی لکھا ہے۔ کشمیری زبان کے معروف شاعر تھے، ترجمہ کار اور نقاد بھی تھے، ان کی ذات ایک ادارہ تھی، ایک انجمن تھی، وہ کسی بھی موضوع پر فنکارانہ انداز سے قلم اُٹھاتے تھے اور لکھتے تھے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے!

موتی لال ساقیؔ کا اصل نام موتی لال رازدان تھا۔ وہ 1935ء میں

بڈیار سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابھی بچپن میں جوانی کے خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ پتاجی نے ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ دیا، وہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے، ماں کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ساقی کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن موتی لال ساقی کے چاچا نے یہ ذمہ داریاں سنبھالیں، اسے پالا پوسا، تعلیم دلوائی، یہاں تک کہ اس کی شادی کی اور الگ گھر بھی دیا۔ موتی لال ساقی کی ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں کشمیر کے ممتاز شاعر عبدالاحد آزاد نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ دیہات سدھار میں آگئے۔ ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر 1966ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ریڈیو کی ملازمت اختیار کی، ریڈیو میں زرعی پروگرام پیش کر کے مقبولیت حاصل کی۔ ریڈیو سے ریاستی کلچرل اکادمی میں آگئے۔ اکادمی میں دوسرے ادبی پروگراموں کے علاوہ کشمیری ڈکشنری سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے ''شیرازہ'' کشمیری کے لئے بہت سارے علمی اور ادبی مضامین لکھے جو عوامی سطح پر پسند کئے گئے اور پھر 1996ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

21/1999ء کو ان کا دیہانت ہو گیا۔

سید رسول پونپر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''شاعری ساقی کا پہلا عشق تھا، وہ ادب کے ترقی پسند نظریات سے متاثر تھے، جدیدیت کا بھی ان پر اثر تھا لیکن ان کی اپنی ایک راہ تھی...... وہ اپنی اسی راہ پر چلتے رہے، لکھتے رہے......!!''

ان گنت اور لاتعداد مضامین کے علاوہ موتی لال ساقی کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ہیں ...... مودری خواب (1996ء)، من سر (1976ء) اور نیری نغمہ (1997ء) ''من سر'' پر 1981ء میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا۔ یہ شعری مجموعہ 136 رباعیات، 20 نظموں اور 15 غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان میں غم جاناں ہے اور غم دوراں بھی...... ''اگر نیب'' نامی ان کی کتاب بھی

تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے آراستہ ہے۔اس کتاب کی اشاعت سے بہت پہلے 1975ء میں ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا،اس نثری تخلیق کا نام ''آنکہ ون'' تھا۔ کلچرل اکادمی نے ان کی بہت سی ترتیب دی ہوئی کتابیں شائع کی ہیں۔ان میں کلیات صمد میر، پرمانند،صوفی شاعر اور کلیات شیخ العالم قابل ذکر ہیں۔

انہوں نے سفرنامے بھی تحریر کئے ہیں۔ان کا ٹامل نائیڈو کا سفرنامہ ادبی اور تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔یہ سفرنامہ 1992ء سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ بے تحاشا سگریٹ پیتے تھے،چائے بھی بہت پیتے تھے،نام ونمود کے ہرگز ہرگز قائل نہ تھے، بہت سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے،ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ان کی مقبول عام غزل ''مودری خواب'' سے ایک شعر۔

تمس زلفن یہ خم روزیا نہ روزیا
غنیمت شام غم روزیا نہ روزیا

میرے محبوب کے زلفوں کے خم رہیں نہ رہیں،شام غنیمت ہے،رہے نہ رہے!!!

جھیل ڈل کا ذکر ان دنوں قریب قریب ہر روز اخبار کی سرخیوں میں نظر آتا ہے۔موتی لال ساقی کا ایک مضمون ''ڈل: منظر پس منظر'' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ان کی پیشنگوئی کو دہراتا ہوں:

''جہانگیر سے لارنس تک ڈل کا دائرہ کم وبیش معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایک جیسا رہا، بیسویں صدی کے آغاز میں جھیل کی حدود میں مداخلت بیجا کا سلسلہ شروع ہوا جو طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔لگتا ہے کہ ہزاروں سال سے سرینگر کے سرہانے ٹکے اس آب حیات کے چشمے ہمارے ہاتھوں خیر نہیں!!''

❁❁❁

33

گلستانِ غزل

درفشاں دِلازاک کا تعلق لکھنو سے ہے اور وہ چاندنی کے قلمی نام سے ناول اور افسانے لکھتی ہیں۔ ''غبار'' ان کا پہلا ناول ہے جو 1997ء میں شائع ہوا۔ اسکے بعد اُن کا ایک اور ناول ''امرتارا'' میری نظر سے گذرا ہے۔ ان کے افسانے ملک کے کئی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ چاندنی نے میرے افسانوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ تاثرات میرے افسانوی مجموعے ''بے ثمر سچ'' میں شامل ہیں۔

ہاشم علی خان دلازاک چاندنی کے والد تھے۔ وہ 1911ء میں الہٰ آباد میں پیدا ہوئے، پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھے لیکن ایک شاعر بھی تھے۔ وہ معروف شاعر بسط بگری کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کا مجموعہ کلام 1941ء میں شائع ہوا۔ ہاشم صاحب کو عربی، فارسی اور اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے جب وہ اپنا کوئی شعر سناتے تھے تو محفل جھوم اُٹھتی تھی لیکن وہ شہرت سے ہمیشہ دور دور ہی رہے، اُن کی دوستی کا حلقہ بھی محدود تھا، وہ اس قدر سادہ لوح انسان تھے کہ کوئی صاحب اُن کا کلام یہ کہہ کر لے گئے کہ وہ شائع کروا دیں گے اور ہاشم صاحب اپنی آخری سانس تک اپنے دوست کی واپسی کا انتظار کرتے رہے اور اس طرح وہ اپنی زندگی میں اپنے کلام کو کتابی صورت میں نہ دیکھ سکے۔ ہاشم علی خان 1994ء میں انتقال کر گئے۔

1999ء میں اُن کی بیٹی چاندنی نے گلستان غزل کے نام سے اُن کا کلام شائع کیا۔ وہ یہ غزلیں اس وجہ سے شائع کرنے میں کامیاب ہوسکیں کہ انہیں

دو ڈائریاں ملیں جن میں ہاشم صاحب نے اپنا بہت سارا کلام قلمبند کیا تھا لیکن ایک ڈائری سے چند اوراق غائب تھے

منزلیں رنج کی اے ہاشم
کچھ تو باقی ہیں کچھ گزار آئے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے گلستان غزل ہاشم صاحب کی غزلوں پر مشتمل ہے، 38 غزلیں اور ایک نظم شامل کتاب ہیں۔ یہ الوداعی نظم انہوں نے جسٹس جگموہن لعل سنہا جی کی تعریف میں لکھی ہے۔

افتخار ملک وملت تو بڑا امتناز ہے
تجھ پر جگموہن ہماری عدلیہ کو ناز ہے

چاندنی صاحبہ مبارک باد کی مستحق ہیں کہ اپنے والد کے کلام کو یکجا کر کے ترتیب دیا اور شائع کروایا ورنہ یہ سارا کلام جانے کس گوشے میں ہمیشہ کیلئے پڑا رہتا۔

یوں تو حاضر ہے تمہارے لئے دل اور جگر
وعدہ جو ہم سے کیا اس کو نبھاؤ پہلے

یہ شعر بھی دیکھئے۔

ہاشم گیا جہاں سے بلا سر سے ٹل گئی
گیسو وہ اپنے کیوں ہیں پریشان کئے ہوئے

گلستان غزل پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہاشم علی خان کی غزلوں میں فکر کی پختگی ہے اور تخیل کی بلندی بھی اور ساتھ ہی زبان وبیان کی چاشنی بھی ہے

کچھ خرابی تو ہوئی پی کے بہک جانے سے
رازِ مے نوش کا باہر گیا مئے خانے سے

اور ایک شعر دیکھئے۔

چھیڑا ہے دل میں عشق نے جو سازِ زندگی
نغمہ طراز اس سے مرا بال بال ہے

❁❁❁

34

ایک خانہ بدوش کی کہانی

مجھے دیوندر ستیارتھی سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ دو ایک بار دلّی کے کافی ہاؤس میں اپنے زمانے کے معروف کہانی کار بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کے ساتھ اور پھر جموں میں، وہ اکثر جموں آتے رہتے تھے اور مرحوم نذیر حسین سمنانی کے مہمان کی حیثیت سے اُن کے اخبار ''سندیش'' کے گیسٹ روم میں ٹھہرتے تھے۔ یہ گیسٹ روم ان کے اخبار کے دفتر کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں موہن یاور بھی ''سندیش'' سے وابستہ تھے اور ماہنامہ ''سنگم'' ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ستیارتھی جی موہن یاور کے کافی نزدیک تھے۔ جموں میں ستیارتھی جی ''کشمیر ٹائمز'' کے مدیر اعلیٰ وید بھسین جی کے ساتھ بھی نظر آتے تھے۔ ہندی کے مشہور کوی چندر کانٹ جوشی بھی ان کے دوستوں میں سے تھے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ان دونوں میں نے ایک کہانی ''علیا اور بلبل'' لکھی تھی اور کسی محفل میں پڑھی تھی۔ ستیارتھی جی اس محفل میں موجود تھے۔ میری کہانی انہوں نے پسند کی تھی اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔

دیوندر ستیارتھی خانہ بدوش ادیب کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں وہ واقعی خانہ بدوش بن چکے تھے۔ بستی بستی، شہر شہر گھوم کر انہوں نے ہزاروں لوک گیت اکٹھا کئے تھے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں وہ اپنے شہر سے قریب قریب بیس برس دور رہے۔ انہوں نے کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک کا سفر کیا اور اپنے عوام کے سامنے ایک ایسا اثاثہ رکھا جس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی۔ یہ لوک گیت ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب کی منہ بولتی

تصویریں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد تین لاکھ کے قرب ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ انہوں نے ان لوک گیتوں پر مضامین بھی لکھے۔

دیوندر ستیارتھی کا اصل نام دیواندر تھا۔ وہ 26 رمئی 1908ء کو پنجاب کے ضلع سنگرو میں پیدا ہوئے۔ 1925ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈے دے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا، وہاں قریب قریب دو سال پڑھنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ پہلی کہانی پنجابی میں لکھی، پہلا مضمون لوک گیتوں سے متعلق تھا جو نومبر 1931ء میں الہ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ہنس'' میں شائع ہوا۔ ان کی پہلی اُردو کہانی کا نام تھا ''اور بانسری بجتی رہی'' جو ادب لطیف لاہور میں شائع ہوئی۔ (دسمبر 1940ء)

تقسیم ملک کے بعد انہوں نے مستقل طور پر دلّی میں رہائش اختیار کی۔ وہ 1948ء سے لے کر 1956ء تک ماہنامہ ''آج کل'' (ہندی) کے مدیر رہے۔

دلی کے قیام کے دوران ایک بار کسی سے کچھ کہے بغیر پاکستان چلے گئے اور وہاں چار ماہ ٹھہرنے کے بعد دلّی لوٹ آئے۔

12 رفروری 2003ء کو ان کا دلی میں انتقال ہو گیا۔

اُن کو کہانیاں لکھنے کا اپنا ایک انداز تھا۔ ان کی کہانیوں میں لوک گیتوں کی سی کشش ہے، ان کہانیوں میں لوک گیتوں کی روح گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔
ستیارتھی جی کے بارے میں مرحوم ساحر لدھیانوی نے کہا تھا:

''کوئی بھی شاعر خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو ہندوستان کی روح کی پاکیزگی کو پیش کرنے میں ستیارتھی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

اور بقول امرتا پریتم:

''دیوندر ستیارتھی کی ہنسی غمگین ہوتی ہے اور غم کھلا ہوا مسکراتا سا ملتا ہے۔ ستیارتھی دنیا بھر کے لوک گیتوں کو اکٹھا کر کے خود ایک لوک گیت بن گیا ہے۔''

ان کی شائع شدہ تصانیف (اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی) کی تعداد 49 ہے۔ اس میں افسانے، ناول، لوک گیت، شاعری، ترجمے، خودنوشت، سفر نامے اور مضامین شامل ہیں۔ کتابوں کی تفصیل یوں ہے:

افسانے مجموعے.......... 14
ناول.......... 8
سفرنامے.......... 1
ترجمے.......... 3
لوک گیت.......... 10
شاعری.......... 5
خودنوشت.......... 2
مضامین.......... 6

ستیارتھی جی کی زندگی پر ہندوستان سے شائع ہونے والے مختلف جرائد میں گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا اور ان گوشوں کے ذریعہ ستیارتھی جی کی ذاتی اور ادبی زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع میسر ہوئے۔

معروف ناقد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کہتے ہیں:

''دیوندر ستیارتھی کا پہلا عشق لوک گیت ہے اور دوسرا افسانہ، چنانچہ وہ اپنی زیادہ تر کہانیوں میں لوک گیتوں کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے افسانہ کی تکنیک میں بھی شکست وریخت سے نہیں چوکتے۔ ان کے افسانوں میں پورا ہندوستان عوامی سطح پر لوک روایتوں کے درمیان ہنستا، کھیلتا، روتا بلکتا، سوتا جاگتا، گاتا روتا، بھوکا اور پیٹ بھرا، پنگھٹ کی گوریوں، کھیت کی پگڈنڈیوں، شہر کی شاہراؤں، غریبوں کی بدمستیوں اور امیروں کی مدہوشیوں میں صاف نظر آتا ہے۔''

اور بقول دیوندر ستیارتھی:

''میرے نزدیک تخلیق تو دراصل زندگی کا قرض چکانا ہے، کبھی یک مشت، کبھی قسطوں میں، کبھی سود کے ساتھ اور کبھی بے سود۔''

✿✿✿

35

کرالہ کور کا خالق

کشمیری زبان وادب اور کشمیری شاعری کو جن شاعروں نے اپنے خونِ دل سے سینچا، اس کی آبیاری کی، اس میں ایک نئی روح ڈال دی ان میں مرحوم فاضل کشمیری کا نام بھی شامل ہے۔

فاضل صاحب کا نام غلام احمد تھا۔ وہ 3 راگست 1916ء کو عالی کدل، سرینگر میں پیدا ہوئے اور 88 سال کی عمر میں 11 رجولائی 2004ء کو گلشن نگر سرینگر میں انتقال کر گئے۔

وہ 1942ء سے محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور اپنی ملازمت کے دوران انہیں ریاست کے دور دراز علاقوں میں جانے کا موقع ملا۔ ان علاقوں میں جا کر گھوم پھر کر انہوں نے زندگی کو اور قریب سے دیکھا اور پرکھا، اپنے تجربات، مشاہدات، احساسات اور جذبات کو شعری روپ دیا۔ اپنے دل کی آواز لوگوں تک پہنچائی، اس آواز میں مٹھاس تھی، شیرینی تھی اور درد و کرب کی وہ لکیریں بھی جو نظر نہیں آتی صرف محسوس کی جاتی ہے۔ وہ جب اپنا کوئی شعر گنگناتے تھے، شاعری میں سناتے تھے تو ماحول میں ایک عجیب سی بے قراری کا احساس جاگنے لگتا تھا۔ کچھ اور سننے کی تڑپ جاگتی تھی، یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایک عوامی شاعر تھے، عوام کے لئے لکھتے تھے، وہ اپنی شعری تخلیقات میں عوام کی نمائندگی کرتے تھے۔

1970ء میں سٹیٹ انسٹی چیوٹ آف ایجوکیشن سے بحیثیت فیلڈ ایڈ وائزر رٹائر ہو گئے۔ ان کی پہلی تخلیق ''گلدستہ فاضل'' (اُردو) 1935ء میں شائع ہوئی اور ان کی آخری تخلیق ''سمندر'' 1988ء میں۔ اس دوران ان کی جو کتابیں

شائع ہوئیں ان کی تعداد 40 کے قریب ہے۔ شری جپ جی صاحب اور شری سکھ منی صاحب کا ترجمہ اردو میں پیش کر کے انہوں نے ہر مکتب خیال سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اسی طرح ''تصویرِ حج'' کے نام سے مکمل حج گائڈ 1958ء میں پیش کر کے حج بیت اللہ پر جانے والوں کی رہبری اور رہنمائی کے لئے ایک جامع اور نیک کام انجام دیا۔ ان کی نعتوں کے مجموعے ''انوارِ محمدی'' کے کوئی بارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی بہت ساری تخلیقات پر انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ انہیں اپنی زندگی میں جو اعزاز اور ایوارڈ ملے ان میں ستھ رنگ پر ریاستی کلچرل اکادمی کا ایوارڈ (1958ء) کاشر سرمایہ پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1990ء) قومی یکجہتی ایوارڈ (1993ء) اور شیخ العالم ایوارڈ قابلِ ذکر ہیں۔

بقول شاہد بڈگامی:

''فاضل کشمیری ہمارے دور کے ایک ایسے حسن کار تھے جن کی تخلیقات میں ذوقِ جمال کا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے تخلیق کار تھے جن کو اپنی زندگی میں ہی مقبولیت کا وہ مقام ملا جن کے لئے صدیاں انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

فاضل صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے۔ انہوں نے اپنی کئی کتابوں کی کتابت خود کی ہے۔ وہ سادگی پسند تھے، کھانے پینے میں سادگی، لباس اور پوشاک میں سادگی، رہن سہن میں سادگی، ظاہری طور انہیں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص کے اندر کشمیری زبان کا ایک عالم، ایک شاعر اور ایک مفکر چھپا ہوا ہے ؎

فاضل خستہ جگر کی یہ دعا قبول ہو
برتر و بالا رہے اسلام کا نام و نشان

فاضل کشمیری دوسروں کی نظر میں......!!

اقبال اور فاضل دونوں شعر کو انسان کی اخلاقی تربیت کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں!

(ڈاکٹر تسکینہ فاضل)

فاضل کشمیری نے انگریزی، اُردو اور عربی زبانوں کا نہ صرف وسیع بلکہ ادیبانہ مطالعہ کیا ہے۔

(جیالال کول ناظرؔ)

فکر کی بلند پروازی، زبان کی شگفتگی اور شیرینی اور تخیل کی جدت آفرینی، فاضل کشمیری کی شاعری کا طرز امتیاز ہے۔

(میر غلام محمد طاؤس)

ان کی نظم ''کرالہ کوری مالہ کریے کوسمن'' آج بھی بے حد مقبول ہے۔
نعت گو شعراء میں فاضل صاحب کا قد اونچا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام اہمیت کا حامل ہے۔ اس کلام میں زبان کی خوبصورتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا ایک آہنگ ہے۔

سلام اے تاجدارِ انبیاء

۞۞۞

36

گبر سنگھ

امجد خان کو اب تک فلموں اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ بھول چکے ہوں گے لیکن گبر سنگھ کو بھولنا شاید ممکن نہ ہوا ہوگا۔ امجد خان نے بہت ساری فلموں میں کام کیا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ، انہوں نے جہاں مسالہ فلموں میں بھی کام کیا وہاں انہوں نے مقبول ومعروف فلم ساز اور ہدایت کار ستیہ جیت رے کی واحد ہندی فلم میں مرکزی کردار ادا کر کے نام کمایا لیکن فلم ''شعلے'' کے گبر سنگھ والی مقبولیت انہیں کوئی اور کردار ادا کرنے سے نہ ملی، دیکھا جائے تو ایسی شہرت اور مقبولیت بہت کم اداکاروں کونصیب ہوئی ہے۔ ''مغل اعظم ''میں پرتھوی راج کپور کو بحثیت اکبر اعظم، ''میرا نام جوکر'' میں راج کپور کو بحثیت جوکر...... مدھو بالا کو انارکلی کے روپ میں، نرگس مدر انڈیا میں اور دلیپ کمار بحثیت دیوداس ، یہ چند ایسے کردار ہیں جن کی مقبولیت میں اتنا عرصہ گذرنے کے بعد بھی کوئی کمی نہ آئی۔

امجد خان کے والد جینت (فلمی نام) اپنے زمانے کے مشہور فلم اداکار تھے، ان کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ امجد خان کے دوسرے بھائی کا نام امیتاز خان ہے وہ بھی فلموں میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے کئی فلموں میں ہدایت بھی دی۔ ٹی وی سریلز میں بھی کام کیا۔

امجد خان 12 ر نومبر 1940ء کو پیدا ہوئے اور اپنی فلمی زندگی کی شروعات بطور چائلڈ آرٹسٹ کی، ان کی پہلی فلم بطور چائلڈ آرٹسٹ ''اب دلی دور نہیں'' 1957ء میں بنی تھی۔ وہ شروع شروع میں آصف خان کے ساتھ بطور

معاون ہدایت کار وابستہ ہو گئے آصف خان کی وفات کے بعد وہ ہدایت کاری سے فلمی اداکاری کی جانب لوٹ آئے۔

1975ء میں ان کے فلمی کیریئر کا باضابطہ آغاز ہوا، فلم تھی ''ہندوستان کی قسم''۔ یہ بات شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ جب ان کی بیوی شہلا خان نے پہلے بیٹے کو جنم دیا تو ٹھیک اسی روز امجد خان نے فلم ''شعلے'' سائن کی اور اس طرح ان کا بیٹا شاداب امجد خان کی زندگی میں شادابی لے کر آ گیا۔ شہلا خان کے بطن سے امجد خان کا ایک اور بیٹا ہے سیماب خان اور ایک بیٹی بھی ہے احلام خان۔ شاداب خان فلمی دنیا کو اپنا چکا ہے۔

امجد خان کی انسان دوستی فلمی دینا میں کافی مشہور رہی ہے، وہ باہر سے جتنے سخت نظر آتے تھے اندر سے اس سے زیادہ نرم دل اور حلیم تھے۔ گبر سنگھ کا کردار نبھانے کے لئے انہوں نے ڈاکوؤں پر لکھی کئی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ڈاکوؤں کی طرح سوچنا اور بولنا شروع کیا تھا اور اس طرح سے امجد خان نے گبر سنگھ کا روپ اپنا کر فلمی دنیا میں ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جو ان کے مرنے کے بعد بھی آج تک قائم و دائم ہے۔ آج بھی فلم ''شعلے'' میں گبر سنگھ کے مکالمے لوگوں کو زبانی یاد ہیں، اس فلم کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فلم ''شعلے'' ممبئی کے میٹرو سنیما میں مسلسل چھ سالوں تک چلتی رہی اور بے تحاشہ روپیہ بٹورتی رہی۔ لوگ دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے رہے اور سنیما گھر کے باہر آ کر گبر سنگھ کے ادا کئے گئے مکالمے دہراتے رہے!

امجد خان کی کئی اور بھی فلمیں ہیں جن میں انہوں نے بہترین اداکاری کی ہے۔ ان میں فیروز خان کی فلم ''قربانی''، گلزار کی فلم ''لیکن''، پرکاش مہرہ کی فلم ''سہاگ'' قابل ذکر ہیں۔ امجد خان نے ہر طرح کے کردار ادا کئے ہیں۔ ''آنسو'' میں انہوں نے مصنف کا کردار ادا کیا۔ ''یارانہ'' میں ان کا کردار بالکل مختلف تھا، ''چمیلی کی شادی'' اور ''لوسٹوری'' میں مزاحیہ کردار ادا کیا۔

سال 1973ء سے لے کر سال 1992ء تک امجد خان نے کم سے کم 35 فلموں میں کام کیا۔ آخر وہ 27 جولائی 1992ء کو انتقال کر گئے لیکن مرتے دم تک نہ تو وہ کیمرے سے دور رہے اور نہ ہی کیمرہ ان سے دور رہا۔

کہا جاتا ہے کہ شراب اور فلم ایک ترازو کے دو پلڑے ہیں لیکن شرابی کا کردار اصلی شرابی سے بہتر نبھاتے تھے۔ ہاں وہ چائے کے بے حد شوقین تھے بلکہ چائے ان کی ایک بڑی کمزوری تھی۔

امجد خان یوں تو ایک معصوم فلم اداکار تھا لیکن گبر سنگھ کے رول میں اس نے جس خونخوار کردار کو جنم دیا، وہ اس کی وفات کے بعد آج بھی زندہ ہے اور شاید کل بھی زندہ رہے گا۔

❁❁❁

37

بسو میرے نینن میں نندلال

میراں کی زندگی اور میراں کی محبت سے کون واقف نہ ہوگا میراں کے گیت سن کر یا پڑھ کر ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان گیتوں نے میراں کی زندگی اور اس کی شخصیت کو آج بھی قائم رکھا ہے۔

کون ہے جو پربھو کو آنے کے لئے کہہ دے۔ ان کا آنا من کو بھاتا ہے...... نہ وہ خود آتے ہیں اور نہ ہی لکھ کر بھیجتے ہیں انہیں تڑپانے کی عادت سی پڑ گئی ہے، میری دو آنکھیں ایسے بہہ رہی ہیں جیسے ساون کی ندیاں......!! (ترجمہ)

میراں 1504ء میں پیدا ہوئی وہ رتن سنگھ راٹھور کی بیٹی تھی 1916ء میں اس کی شادی چتوڑ کے راجہ سانگا کے بیٹے سے ہوئی، شادی کے بعد جب وہ سسرال آئی تو کرشن جی کی مورتی بھی ساتھ لے آئی، وہاں یہ کوشش کی گئی کہ میراں کرشن جی کی پوجا کرنے کی بجائے درگا ماتا کی پوجا کرے لیکن میراں نے اپنے پریتم سے جدا ہونا کسی بھی قیمت پر منظور نہ کیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور اپنے پریتم کی محبت میں سرشار ہونے لگی۔ سادھوؤں کی صحبت میں اسے لطف آتا تھا، اس کی ساس اور سسر چاہتے تھے کہ وہ سادھوؤں سے نہ ملے لیکن اس کا بھی میراں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ ایک مندر میں پوجا کرنے کے سمے میراں نے اپنی ماں سے پوچھا:

"میرا دولہا کون ہے؟"

ماں نے مورتی کی طرف دیکھ کر ہنسی ہنسی میں کہہ دیا:

"تیرا دولہا گردھر گوپال ہے"

اور اس دن سے میراں نے کرشن جی کو اپنے من مندر کا دیوتا بنایا۔

1959ء میں ایک ریٹائرڈ آئی اے ایس آفیسر چودھری جے کشن نے ''میراں کے گیت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کتاب کو ادارہ انیس الہ آباد نے شائع کیا تھا اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میراں کے متعلق کئی باتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب اکبر اعظم کو میراں کی خوبصورتی اور بھگتی کی جانکاری ملی تو وہ مشہور موسیقار تان سین کے ساتھ فقیر کے لباس میں چتوڑ آیا۔ اکبر میراں کی عقیدت دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور اس کے پریتم کے لئے ایک قیمتی ہار نذر کیا اور خود لوٹ آئے جب چتوڑ کے مہاراجہ کو اکبر اور تان سین کی آمد کے بارے میں جانکاری ملی وہ بہت ناراض ہو گئے انہوں نے میراں کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا چنانچہ ایک زہریلا سانپ ڈبیا میں بند کر کے بھیجا جب میراں نے اسے کھولا تو اسے اپنے سالک رام (کرشن جی) نظر آئے، میراں خوشی سے جھوم اٹھی۔

کہتے ہیں کہ میراں کا خاوند تخت نشین ہونے سے پہلے ہی مر گیا اور میراں کا دیور چتوڑ کا راجہ بنا۔ اس نے میراں کو کرشن بھگتی کی وجہ سے بہت پریشان کیا وہ چتوڑ سے بھاگ گئی اور بندرابن میں مشہور بھگت رام داس کی چیلی بن گئی۔

''پیارے اب مجھ پر رحم کر، میں تمہاری داسی ہوں میرے مالک اب کب ملوگے اور من کی آس کب پوری کروگے!!''

بندرابن کی گلیوں میں وہ دیوانہ وار گھومتی رہی، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں بال بکھرے ہوتے، کبھی گاتی اور کبھی ہنسنے لگتی تھی۔ اس کے مدھ بھرے خوبصورت ہونٹوں سے درد بھرے نغمے نکلتے جن کو سن کر بے خودی کا عالم چھا جاتا۔ کوئی تعظیم سے جھک جاتا، بچے اس کے گلے سے لپٹ جاتے......!!

میراں کی محبت کا مرکز کرشن جی تھے جن کو میراں نے ان گنت ناموں سے یاد کیا..... گردھر لال، نند لال، گوپال، سانوریا، شیام، منموہن، مراری، مرلی

والے اور ہری۔ رام کے نام کو بھی میراں نے کہیں کہیں اسی مدعا سے استعمال کیا۔
شروع شروع میں میراں نے کرشن جی کو ایک دوست کی شکل میں لیا۔ پھر پتی کے روپ میں اور آخر میں گرو کی صورت میں دیکھا بچپن کی محبت عمر کی پختگی کے ساتھ بتدریج بڑھتی گئی اور آخر میں دیوانگی کی حد کو بھی پار کر گئی۔ اس نے اپنی محبت کے لئے مثالی قربانی دی۔ اپنی زندگی اور اپنے شباب کی آرزوئں کو اپنی محبت پر نثار کیا، راج پاٹ کے تمام آرام و آسائش پر لات ماری اور تمام دنیاوی خوشیوں کو چھوڑ کر اپنے پریتم کی داسی بن گئی۔

بندرابن سے میراں دوارکا کی یاترا پر چل پڑی جو کہ کرشن جی کی آخری جائے رہائش تھی۔ وہاں کرشن جی کی مورتی سے لپٹ کر آخری سانس لی......!!

چودھری جے کشن میراں کے گیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ سارے گیت آگ اور تڑپ سے بھرپور ہیں، ہر گیت ایک پر کیف نغمہ ہے ان گیتوں میں میراں کی روح سمائی ہوئی ہے، میراں نے اپنے گیتوں کے ذریعہ دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی ہے......!

اور شاید یہی وجہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی میراں کے گیت زندہ جاوید ہیں......!!!

❁❁❁

38

ایک چہرہ، کئی انداز

اصل نام : عبدالحئی **فلمی نام** : ساحر لدھیانوی

پیدائش : 8 مارچ 1921ء لدھیانہ

وفات : 25 اکتوبر 1980ء ممبئی

ساحر لدھیانوی نے اپنی تعلیم خالصہ ہائی سکول اور گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں حاصل کی۔ وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایک خوشحال اور آسودہ گھرانہ تھا، جہاں زر کی کوئی کمی نہ تھی، بلکہ زن کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ ساحر لدھیانوی کے والد چودھری فضل محمد شہر کی ایک معزز شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں گیارہ شادیاں کی تھیں اور ساحر کو ان کی گیارہویں بیوی نے جنم دیا تھا۔ ساحر کی پیدائش کے بعد میاں بیوی کے تعلقات بگڑ گئے۔ ساحر کے والد چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے کی پیدائش کی تشہیر نہ ہو لیکن بیوی کی مرضی تھی کہ اسے اور اس کے بیٹے کو وہ سارے حقوق ملنے چاہئیں جس کے وہ حقدار ہیں۔ اپنے بیٹے کو جائز حقوق دلوانے کے لئے ماں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ مقدمہ بازی تقسیم ملک تک جاری رہی۔ اس کا منفی اثر ساحر کے دل و دماغ پر پڑا۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ لاہور آ گئے، اب ان کی شعر گوئی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ان کی مقبول ترین کتاب ''تلخیاں'' کا پہلا ایڈیشن لاہور میں ہی چھپا۔

1945ء میں ساحر ممبئی آ گئے اور دھیرے دھیرے فلمی دنیا میں بحیثیت ایک گیت کار چھا گئے۔

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے

ساحر نے اپنی زندگی میں کئی عشق کئے۔ ساحر کے معاشقوں کے بارے میں مختلف روایات ہیں لیکن امریتا پریتم نے خود ہی اپنی سرگشت ''رسیدی ٹکٹ'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ساحر کو بے تحاشا چاہتی تھی، اس طرح سدھا ملہوترہ اور ساحر کی عشقیہ داستان کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ماہنامہ ''شمع'' پڑھنے والے اس داستان محبت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی محبت بہت عرصہ تک اخباری سرخیوں کی زینت بھی بنی رہی لیکن بعد میں دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

محبتیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی کی
مجھے بھی کوئی کہتا ہے کہ یہ جلوے پرائے ہیں

تصانیف:

ا۔ تلخیاں ...... اس کتاب کے 25 سے زائد ایڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ پرچھائیاں ...... یہ ایک طویل نظم ہے۔

۳۔ آؤ کہ سو جائیں ...... یہ مجموعہ کلام 1972ء میں شائع ہوا۔

ساحر لدھیانوی کی ان تینوں کتابوں کے تراجم غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوئے۔ ساحر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ اس تحریک کو بڑھاوا دینے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ان کی یہ وابستگی تادم آخر قائم رہی۔

یہ سب جانتے ہیں کہ ساحر نے ممبئی میں ایک بڑی کوٹھی کھڑی کی تھی ''پرچھائیاں'' کے نام سے ...... لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ اک چھوٹے سے کمرے میں قیام کرتے تھے اور اس کمرے میں صرف کتابیں اس کی ہم راز تھیں، وہ کتابوں سے باتیں کرتے تھے۔ حالانکہ ممبئی میں ان کی مالی حالت بہت ہی تسلی بخش تھی، فلمی دنیا کو اپنا کر ان کا شمار امیر لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ اپنی ذات کی بجائے

دوسروں پر خرچ کرتے تھے، رشتہ داروں کی کفالت اور دوستوں کی خاطر مدارت ان کی ایک عادت بن چکی تھی، شراب اور تمباکو نوشی ان کی کمزوریاں جانی جاتی تھیں۔ (کہا جاتا ہے کہ گھر میں وہ بیڑی پیتے تھے)۔ شراب پینے کے بعد اکثر غصہ کرتے تھے اور کچھ دیر بعد خود ہی نارمل ہو جاتے تھے۔ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف تھے وہ اس غصے کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔

ساحر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ

(۱) وہ بے مثال ادبی شاعر تھے۔

(۲) وہ پہلے اُردو شاعر ہیں جن کی شاعری کی کتابیں اُردو کی نثری کتابوں سے زیادہ چھپی ہیں۔

(۳) وہ پہلے فلمی شاعر تھے جنہوں نے اپنی فلمی شاعری میں نہ صرف ایک خاص ادبی معیار قائم رکھا بلکہ ساری فلمی انڈسٹری میں شاعروں کی اہمیت کا احساس دلوایا۔

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ ساحر کی شاعری کی بنیاد شدتِ احساس پر ہے اور اُن کے اسلوب کا حُسن بھی شدید احساس سے ہی عبارت ہے۔

کیا ہوا اگر میرے یاروں کی زبانیں چھپ ہیں
میرے شاید میرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

سراخ نقوی کا تحریر کردہ ایک مضمون میں نے حال ہی میں پڑھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ساحر کی شاعری کا سب سے بڑا وصف اس کے لفظوں کی سچائی، سادگی اور سلاست ہے اور یہ وصف اُنہیں اپنے کئی ہم عصر شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اپنی پوری شاعرانہ دیانت سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

❁❁❁

39

''عالم آرا'' سے ''مغل اعظم'' تک

1929ء میں ہندوستان میں بھارت فلم کمپنی اور رنجیت فلم کمپنی وجود میں آئیں۔ ابتداء میں اسٹوڈیو میں بہت زیادہ set (سیٹ) نہیں ہوتے تھے عموماً جنگلات، محلات اور بازاروں کے منظر پردے پر اُتارے جاتے تھے۔ اسی پس منظر میں 1931ء میں پہلی بولتی فلم عالم آرا کی نمائش ہوئی، اس فلم کی نمائش سے خاموش فلموں کے دور کا خاتمہ ہوگیا اور بولتی فلموں کا آغاز ہوا۔ عالمآرا کی تخلیق ہندوستان کی فلمی تاریخ کا ایک اہم واقعہ رہا ہے جو لوگ پہلے تھیٹر کے رسیا تھے وہ اب بولتی فلم کو دیکھ کر فلموں کے شیدائی بن گئے۔ فلم عالم آرا کے ہدایت کار اودیترا ایرانی تھے اور فوٹو گرافی عادل ایرانی کے سپرد تھی۔ فلم کی کہانی اور مکالمے جوزف ڈیوڈ نے لکھے تھے اور اس فلم کے اداکاروں میں ماسٹر وٹھل، زبیدہ، جلو بائی، جگدیش سیٹھی، سوشیلا، ڈبلیو ایم خان اور پرتھوی راج کپور شامل تھے۔

اور آج ہم بات کرتے ہیں آنجہانی پرتھوی راج کپور کی، فلم مغل اعظم میں ان کا کہا ایک مکالمہ آج بھی کانوں میں گونجتا رہتا ہے:

''سلیم یہ مت بھولو کہ ہم تمہارے شفیق باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے شہنشاہ بھی ہیں''۔

پرتھوی راج کپور 3 نومبر 1906ء میں لائل پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا، جب وہ پشاور میں ایور کالج میں پڑھتے تھے تو سٹیج کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن شوق ذہن کے بند دریچوں میں ہی پروان چڑھتا رہا، ادھر ان کی شادی ہوگئی اور 1928ء وہ اپنے تین بچوں کو اپنی بیوی کے

پاس چھوڑ کر پشاور آ گئے اور پھر پشاور سے ممبئی۔ یہاں 1931ء میں ہی ہندوستان کی پہلی بولتی فلم عالم آرا میں کام کیا اور اس طرح سے ان کی فلمی زندگی کا آغاز ہو گیا لیکن ان کا پہلا پیار اسٹیج تھا اور اسی پیار کی وجہ سے 1931ء میں انگریزی میں شیکسپئر کے لکھے ناٹک کرنے والی ایرین تھیٹر کمپنی سے وابستہ ہو گئے، اس دوران انہوں نے فلم ودھا پتی (1937) اور سکندر (1941) نامی فلموں میں کام کیا۔

نیو تھیٹرز کمپنی جب وجود میں آئی تو اس کی پہلی فلم ''راج رانی میرا'' تھی جس میں درگا کھوٹے نے پرتھوی راج کپور کے مقابلے میں کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فلم بری طرح ناکام ہوئی۔

1944ء میں پرتھوی راج کپور نے تھیٹرز کی بنیاد ڈالی اور پہلی بار ہندوستان میں جدید اور پیشہ ور شہری اسٹیج کی روایت کو مضبوطی دی۔ پاسا نام کے ناٹک پر انہوں نے 1957ء میں فلم بنائی جس کی ہدایت کے دوران ان کے گلے میں کوئی خرابی پیدا ہوئی اور پرتھوی تھیٹر بند کیا۔

جہیز (1950)، آوارہ (1951)، زندگی (1964)، آسمان محل (1965)، تین بہورانیاں (1968) میں کام کر کے پرتھوی راج کپور نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔

فلم ''مغل اعظم'' میں کام کر کے انہوں نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے کردار کو لافانی کر دیا۔

راج کپور، شمی کپور اور ششی کپور ان کے بیٹے تھے۔ یہ تینوں فلمی دنیا کے بے حد مقبول ہیرو رہے ہیں۔ پرتھوی راج کپور کی ساری فیملی، بیٹے، بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں فلمی دنیا کو اپنا چکی ہیں اور اپنا رہی ہیں۔ 1971ء میں پرتھوی راج کپور کے بڑے بیٹے راج کپور کے بیٹے رندھیر کپور نے فلم ''آج کل آج'' پروڈوس کی جس میں ان کے دادا اور والد نے بھی اداکاری کی۔ دادا اور پوتے کے درمیان جنریشن گیپ اور اس میں الجھے ایک باپ کی دشواریوں کو دکھانے والی یہ فلم لوگوں

میں کافی مقبول ہوئی۔

پرتھوی راج کپور نے اپنی فلمی زندگی کے دوران بے شمار فلموں میں کام کیا۔ ان کی آواز دوسرے فلمی اداکاروں سے بالکل مختلف تھی، جب اسکرین پر ان کی یہ گرجدار آواز گونجتی تو لگتا جیسے اسکرین ابھی ابھی پھٹ جائے گا اور سنیما ہال میں بیٹھے لوگوں کو یہ آواز اپنی لپیٹ میں لے گی۔

پرتھوی راج کپور کے والد کا نام دیوان بشیمبر ناتھ تھا، وہ پشاور میں پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ انہوں نے بھی راج کپور کی فلم آوارہ میں ایک مختصر سا رول ادا کیا تھا۔

ہندی سنیما میں خدمات کے لئے پرتھوی راج کپور کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

فلمی اداکاری کے پہلوؤں کو فلمی پردے پر دکھانے والا یہ بلند قامت اداکار کینسر کی وجہ سے 29 رمئی 1972ء کو دنیا سے الوداع ہوگیا۔ ان کی وفات کے بہت سال بعد پرتھوی تھیٹرس کو ان کے بیٹے ششی کپور نے ایک بار پھر شروع کیا، ششی کپور تو اپنی عمر اور کچھ اپنی صحت کی وجہ سے تھیٹر کے کام کاج میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکے یا زیادہ وقت نہ دے سکے۔ اس لئے ان کی بیٹی سنجنا نے تھیٹر کی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں۔ اب پرتھوی تھیٹر بھی پرتھوی راج کپور کی طرح ایک چھایادار درخت کا روپ اپنا چکا ہے۔

✿✿✿

40

سات سوالوں کی ایک کہانی

1972ء میں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نے حکومت جموں و کشمیر کے تعاون سے نادر کتابیں شائع کرنے کا ایک پروگرام اس بنیادی مقصد کے پیش نظر ترتیب دیا کہ پرانی کتابیں کمیاب ہوتی جارہی ہیں اور جو کتابیں میسر ہیں اُن میں سے بھی اکثر قابل اعتبار نہیں ہیں۔ مکتبہ جامعہ کو ایسی کتابیں نفاست اور سلیقے کے ساتھ شائع کرنے کے لئے ریاسی حکومت نے مالی امداد منظور کر لی۔ ان کتابوں کا انتخاب کرنے کے لئے ایک مجلس مشاورت قائم کی گئی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اس کے صدر تھے اور شاہد علی خان کنوینز۔ اس پروگرام کے تحت پچیس اور تیس کے قریب کتابیں از سر نو شائع کی گئیں۔ یہ سلسلہ کب اور کیوں بند ہوا اُس کے بارے میں تفاصیل حاصل نہ ہوسکیں، لگتا ہے کہ حکومت نے مالی امداد فراہم کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت نہ دیا ہوگا۔

اس اشاعتی پروگرام کے تحت مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نے سید حیدر بخش حیدری کی کتاب قصہ حاتم طائی کو بھی نئے رنگ و روپ کے ساتھ شائع کیا۔ تصحیح و ترتیب اطہر پرویز نے کی تھی۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل موسوم بہ ''قصہ حاتم طائی'' کو آج بھی مقبولیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں حاتم طائی کی سات سیروں یا سات سوالوں کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عبدالغفور نساخ نے اپنی کتاب ''تذکرہ سخن شعراء'' میں مرحوم حیدری کی کتاب کو ہفت سیر حاتم کا نام دیا ہے۔

اطہر پرویز صاحب کے مطابق حیدری صاحب نے اگرچہ قصہ حاتم طائی 1801ء میں مکمل کی تھی لیکن یہ 1805ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ حیدری صاحب کو شعروشاعری کا بھی شوق تھا لیکن ان کے کلام کو نہ تو زیادہ اہمیت ملی اور نہ ہی شہرت۔ شاعر ہونے کے ناطے ہی وہ حیدری تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

اطہر صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ حیدری کو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اگرچہ وہ ساری کتابیں شائع نہ ہوسکیں اور نہ ہی اُن کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔

حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج میں ماتحت منشی کی حیثیت سے چالیس روپے ماہوار تنخواہ پر ملازمت کرتے تھے۔ یہ 1801ء کی بات ہے، کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ بنارس آگئے جہاں 1823ء میں وفات پاگئے۔

اُن کی تصانیف یوں ہیں:

(۱) قصہ مہر و ماہ (۲) قصہ لیلیٰ مجنون (۳) ہفت پیکر (۴) تاریخ نادری (۵) گلزار دانش (۶) گلدستہ حیدری (۷) گلشن ہند (۸) توتا کہانی (۱۹) قصہ حاتم طائی (۱۰) گل مغفرت (۱۱) جامع القوانین

حیدر بخش حیدری کی تصنیف ''توتا کہانی'' 1801ء میں کالج نصاب میں شامل کی گئی۔ آرائش محفل یا قصہ حاتم طائی پر حیدری کو 1805ء میں چارسو روپے کا انعام ملا۔ جامع القوانین پر بھی انہیں ایک سو روپیہ کا انعام ملا۔

حیدر بخش حیدری کی تصنیف حاتم طائی کے بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں کہ اس قصے کی بنیاد ایثار اور خدمت گذاری کے جذبہ پر قائم ہے، حاتم کا ہر قدم نیکی کی جانب ایک قدم ہے۔

ممتاز حسین لکھتے ہیں کہ حیدر بخش حیدری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مقصد کو اصل کہانی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

حاتم طائی کے ساتھ سوالوں میں سے تین سوال بہت ہی اہم ہیں اور عظیم اخلاقی قدروں کے حامل ہیں۔

(۱) نیکی کر دریا میں ڈال

(۲) کسی سے بدی نہ کر اگر بدی کرے گیا تو بدی پائے گا۔

(۳) سچ کہنے میں ہمیشہ راحت ہے۔

حیدر بخش حیدری کو یہ دنیا چھوڑے اب قریب قریب 185 برس ہو چکے ہیں لیکن آج کے جدید اور سائنسی دور میں بھی ان سوالوں کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی تصانیف میں حیدر بخش حیدری آج بھی زندہ ہیں.....!!!

❁❁❁

41

اُردو کا انقلابی شاعر......مخدوم محی الدین

زمان و مکان کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زمانی ہوتا ہے اور ایک شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی تجربات اور احساسات بھی بدل جاتے ہیں......!!		(مخدوم محی الدین)

مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش 4 فروری 1908ء ہے اور تاریخ وفات 25/اگست 1968ء۔

کہتے ہیں کہ مخدوم طالب علمی اور نوجوانی کے دور میں ایک اعلیٰ درجے کا ظریف، خوش باش اور خوش مزاج انسان کے روپ میں چمکتا دمکتا رہا، اس کی جوانی کے احوال کے بارے میں سبط حسن لکھتے ہیں:

''آمنوی رنگ کا ایک نہایت وجیہہ نوجوان، لمبے لمبے سیاہ بال، چوڑی پیشانی، ستواں ناک اور دیوتاؤں جیسے نقوش......''

اور دیکھئے کیا کہتے ہیں علی سردار جعفری:

بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، نظروں میں عقاب کی نظروں کا تیزہ، رخسار کی ہڈیوں کا ہلکا سا اُبھار، بلند پیشانی، صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کرتی ہیں، ایک ہلکا سا تبسم اور دوسری اسکی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت......''

خواجہ احمد عباس کی رائے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں:

''مخدوم ایک جلتے ہوئے شعلے کی طرح تھے، اسکے ہاتھ شبنم کی قطروں کی طرح خوشگوار طور ٹھنڈے تھے، وہ انقلاب کی گرج دار آواز تھے

اور پائل کی طرح شیریں بھی، وہ سراپا علم عمل اور عقل تھے، وہ انقلابی سپاہی کی بندوق اور موسیقار کے ستار تھے......''

مخدوم کی شاعری کی ابتداء 1930ء اور 1933ء کے درمیان ہوئی جبکہ ان کی عمر الگ بھگ 25 سال کی تھی، وہ اپنے خیالات کا اظہار نظم و نثر دونوں اسالیب میں بخوبی کر سکتے تھے۔ ایشور راج ماتھر کہتے ہیں کہ مخدوم کی نثر میں بھی زیادہ تر شاعری کا ہی رنگ جھلکتا ہے۔ مخدوم ابتدائی دور سے ہی انقلابی نظریات اور خیالات کے حامی تھے۔ مخدوم کی شاعری اس دور کی پیداوار ہے جبکہ زمین داری نظام نے ہندوستان اور خاص طور سے حیدر آباد میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں، وہ چاہتے تھے کہ محنت کشوں کو کم سے کم پیٹ بھر روٹی ملے، سر چھپانے کے لئے مکان اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا مل سکے، انہیں ملک کی غربت نے بڑا احساس کر دیا تھا۔

انہوں نے نظم انقلاب اسی زمانے میں لکھی، جب آزادی کی قومی تحریک میں کچھ ڈھیلا پن آ گیا تھا۔ مخدوم انقلاب کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ لگتا ہے کہ انقلاب ہی ان کا محبوب ہے۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہیں
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرِ ریگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے!!

مخدوم کی پوری زندگی ایک ڈرامہ تھی، ابتدائی دور کی مخدوم کی رومانی شاعری اس کی میٹھی آواز اور رسیلا ترنم جادو جگاتے تھے، مخدوم کے نجی خطوط، کہانیاں، سفرنامے، مقالے، ڈرامے، رومانی اور سیاسی شاعری اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں، ''حیات لے کے چلو''، ''کائینات لے کے چلو''، ''چلو تو سارے مانے کو ساتھ لے کے چلو''، جیسی نظمیں لکھنے کے بعد اُن کی شاعری کا رنگ نکھر گیا

لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا آزادی کا
گل نار ترانا گاتا ہے
آزادی کا آزادی کا

مخدوم کی سیاسی شاعری کے بارے میں معین شاکر لکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی شاعری کے بنیادی عناصر اور عوامل حُب الوطنی، آزادی کی تڑپ، فرسودہ سماج کو بدلنے کا عزم، انقلاب کی تمنا اور اشتراکیت کے خواب کو حقیقت بنانے کے لئے جدوجہد ہے، مخدوم کی سیاسی شاعری کو انقلاب کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔

وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا ستم
کیا میں اس رزم کا خاموش تمنائی ہوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا میں مجاہد نہ بنوں؟

مخدوم نے 1941ء میں معلمی کا پیشہ ترک کیا۔ 1939ء سے لے کر وہ 1941ء تک سٹی کالج میں اُردو پڑھاتے تھے۔ 1941ء میں کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور عملی سیاست سے وابستہ ہو گئے اور کیمونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔ وہ کئی بار جیل گئے اور پھر 1956ء کے بعد ایک طویل عرصہ تک قانون ساز کونسل میں اپوزیشن کے لیڈر رہے۔

مخدوم محی الدین کا پہلا مجموعہ کلام سُرخ سویرا، کے نام سے 1944ء میں شائع ہوا۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''گل تر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں شامل کلام نے مخدوم کے فن کو ایک نئی کروٹ سے روشناس کرایا۔ ان کی تیسری شعری تخلیق کا نام ''بساطِ رقص'' ہے۔

بقول خواجہ عبدالغفور:

"جب مخدوم زندہ تھے تو دوریوں اور مسافتوں کے باوجود اسکا ہر نیا شعر ہم کو ان کے قریب کردیتا تھا اور جبکہ عرصہ ہوا ہم بچھڑ چکے ہیں تو ان کی باتیں یاد آتی ہیں جن کا سلسلہ دراز ہے"

مخدوم نے کہا تھا:

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یار غمگسار کی بات

۞۞۞

42

ایک شاعر، ایک مدیر...... صابر دت

صابر دت کو مقبولیت اس وجہ سے نہیں ملی کہ وہ اُردو کے بزرگ اور منفرد افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر کے قریبی رشتہ دار تھے اور نہ ہی اس وجہ سے کہ مرحوم ساحر لدھیانوی کے قریب ترین دوستوں میں سے تھے بلکہ صابر دت بذات خود ایک شخصیت کا نام ہے، ایک شاعر اور قلمکار کا نام ہے، ایک مدیر اور ایک صحافی نام ہے۔

میر پور کشمیر میں 9 ستمبر 1938ء کو پیدا ہونے والے صابر دت (اصل نام کلبوشن دت) اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ چند برس قبل ان کا ممبئی میں دیہانت ہو گیا، ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کی چند اہم جھلکیاں یوں ہیں:۔

پہلا شعری مجموعہ ''پل دو پل'' 1966ء میں شائع ہوا، اسکے فوراً بعد 1965-66ء کی بہترین نظموں کا انتخاب مرتب کیا۔

دوسرا شعری مجموعہ ''موج عارض'' 1993ء شائع ہوا۔ 1963ء میں دہلی سے ایک رسالہ ''روپ'' نکالا، جو دیوناگری لپی میں شائع ہوتا تھا۔

1967ء میں دہلی سے پندرہ روزہ جریدہ ''دلی والا'' نکالنا شروع کیا اور یہ سلسلہ 1969ء تک جاری رکھا۔

ایک مشاعرے میں حصہ لینے کی غرض سے صابر دت ممبئی آئے اور پھر ساحر لدھیانوی کے کہنے پر ممبئی میں ہی سکونت اختیار کی۔ اس طرح وہ ساحر لدھیانوی کے اور قریب آ گئے۔

1965ء میں سہ ماہی رسالہ ''فن اور شخصیت'' کی اشاعت شروع کی۔

"فن اور شخصیت" کے خصوصی شمارے کافی مقبول ہوئے۔ مہندر ناتھ نمبر، جان نثار اختر نمبر، کمیلشور نمبر، فیض احمد فیض نمبر، قتیل شفائی نمبر، نرگس دت نمبر، کشمیری لال ذاکر نمبر، ساحرلدھیانوی نمبر کے علاوہ غزل نمبراور مقبول شعراء نمبراپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ وفات سے پہلے وہ ویدراہی نمبر اور صفیہ اختر نمبر کی تیاریوں میں مصروف تھے، ان کے بارے میں وہ اعلان بھی کر چکے تھے۔

"چند تصویر بتاں" ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم کارنامہ ہے، اس عنوان سے صابر دت نے اُردو کے معروف ومقبول قلم کاروں کی ایک البم تیار کی تھی، جس میں امیر خسرو سے لیکر 1991ء تک اہم قلکاروں کی تصاویر یکجا کی ہیں۔ ان کی اس کاوش کو بے حد سراہا گیا۔

ان کی شاعری کے بارے میں کشمیری لال ذاکر کہتے ہیں:

"صابر دت اپنی شاعری سے سماج کی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے، اس کی نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ نئی پیڑھی کے کیا مسائل ہیں، ان کی کیا مانگیں ہیں وہ کس طرح کی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

میں اٹھا اور بے سوچے چلنے لگا
ہر قدم پہ چراغ ایک جلنے لگا
گرد تاروں کی پاؤں پر جمنے لگی
اور کی ندی بہہ بہہ کے تھمنے لگی

صابر دت کے والد پولیس میں ملازم تھے۔ تقسیم ملک کے وقت ان کے والد کو ان کی نظروں کے سامنے راجوری جموں میں قتل کیا گیا۔ ظہیر علی لکھتے ہیں:

"اس لڑکے نے اپنی نفرت پر کس طرح قابو پایا، جنھوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔"

اس کا جواب صابر دت اپنی ایک نظم میں دیتے ہیں۔

ماں کے آنچل میں لہو

باپ کے ہاتھوں میں لہو

کوئی ہندو نہ مسلمان

سبھی مظلوم تھے وہ

مظلوم مرے......کوئی لیڈر نہ مرا!!

صابر دت کی شخصیت، زندگی اور مدیرانہ صلاحیتوں کے بارے میں چند تاثرات پیش ہیں:

- اُردو زبان کا ایک نام صابر دت ہے۔ (ڈاکٹر راہی)
  صابر دت نے اُردو ادب میں اپنے لئے ایک قابل رشک مقام بنالیا ہے۔
  (سردار جعفری)
- صابر دت زندگی کی ہر کیفیت کو صرف اپنے محسوسات کی آنکھ ہی سے دیکھتا ہے۔
  (فکر تونسوی)
- صابر دت کی ایک خوبصورت نظم ''ستیہ کھتا'' اس قدر مقبول ہوئی کہ ملک کے تقریباً ہر اخبار اور رسالے نے اس کی ستائش کی۔ (ویدراہی)
- میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ''چند تصویر بتاں'' اور کوائف نمبر جیسے منفرد کام صرف صابر دت ہی کر سکتے ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی)
- مجھے یقین ہے کہ حوالوں کے لئے مجھے کئی مرتبہ ''چند تصویر بتاں'' سے رجوع کرنا پڑے گا۔ (محمد عمر میمن)
- صابر دت نے اپنی محنتوں سے ایسے البم کی ترتیب دی ہے جو جبلی حصاروں سے آزاد ہے۔ (باقر مہدی)
- یہ بڑے دکھ اور المیے کی بات ہے کہ صابر دت جیسے نئے نئے چراغ جلانے والے فنکار، دل میں اُتر جانے والے شاعر کو یہ کہنا پڑے ؎

بے گھری کا کرب، فکر آب و گندم کی سزا

ہم بھی اپنے دیس میں اُردو کے فنکاروں میں ہیں

(واجدہ تبسم)

❁ وہ کنواں کنواں جھانکتا پھرتا ہے اور خشک کنوئیں اسکی زندگی کے اصل خدوخال بناتے ہیں۔ (اقبال متین)

❁ قطعہ گوئی میں صابر دت نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ وہ شہنشاہ قطعات کہے جانے لگے۔ (یوسف ناظم)

کیف سے رات جھومتی ہے جب
اس طرح کوئی یاد آتا ہے
جیسے پچھلے پہر بیابان میں
کوئی دیوانہ ہیر گاتا ہے

❁ ڈاکٹر داؤد کاشمیری اپنے ایک مضمون ''آئینہ بے عکس نہیں'' میں لکھتے ہیں:

''صابر دت نے گاؤں کی حسین فضاء دیکھی، زمیں کو دلہن کے روپ میں دیکھا اور پھر شہر کے بے معنی ہنگاموں کے ذریعے اس دلہن کی عصمت دری دیکھی اور پھر بے حس تماشائیوں کے سامنے اس بے گور وکفن لاش کو اُٹھا کر دفنانے کا فریضہ بھی اسی نے انجام دیا لیکن ان کی بصیرت اور حساسیت نے اس دلہن کی مانگ کے سیندور کو اپنی شاعری میں محفوظ کر لیا۔''

جاڑے کی گلابی راتوں میں ایسا بھی مہینہ آتا ہے
کشمیری چادر اوڑھے ہوئے ہیرے کا نگینہ آتا ہے

❁❁❁

ڈوگری شاعری کے دوستون

مہاراجہ رنبیر کا زمانہ علمی ، ادبی اور تمدنی نقطہ نظر سے ڈوگری تاریخ میں سنہری زمانہ کہلاتا ہے، مہاراجہ خود ایک عالم تھے اور ملک کے عالموں اور فاضلوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کے عہد میں ڈوگری زبان کی ترویج اور اشاعت کے کاموں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے عہد میں جموں میں ایک اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم گاہ بنوائی ، جہاں اُردو ، فارسی انگریزی اور سنسکرت پڑھانے کا معقول انتظام تھا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ڈوگری زبان کی جانب خاص توجہ دی۔ ابتدائی درجوں میں ڈوگری کا پڑھنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ان باتوں کا اظہار معروف قلمکار ویدراہی نے اپنی کتاب ''جگدیاں جوتاں'' میں کیا ہے۔ یہ کتاب جنوری 1957ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اُس دور کے گیارہ ڈوگری زبان کے شاعروں کے ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اُردو جاننے اور پڑھنے والوں کے لئے ڈوگری کلام کا اُردو ترجمہ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ڈوگری سنستھا نے شائع کیا ہے۔ اُردو رسم الخط میں سنستھا کی جانب سے شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے اور اس تعلق سے ڈوگری کلام کو اُردو نثر میں پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ ان گیارہ شاعروں میں سے جن شعراء سے ذاتی طور پر ملا ہوں یا جن کو ذاتی طور پر جانتا ہوں ، ان میں پنڈت رام ناتھ شاستری ، دینو بھائی پنت ، کیر سنگھ مدھوکر ، یش شرما ، وید پال دیپ اور تارا سماعیل پوری شامل ہیں ان میں آج شاستری جی یش جی اور تارا جی حیات ہیں اور ڈوگری زبان وادب میں برابر اضافہ کرنے میں مصروف ہیں۔

آج کے کالم میں پہلے کیر سنگھ مدھوکر کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

مدھوکر کی شعری تخلیقات میں اس کا مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی تخیل، شاعری میں حقیقت اور احساسات کا ایک نرالا امتزاج ہے، ان کے اشعار میں یقین اور خلوص جھلکتا ہے، وہ یاسیت اور محرومی سے دور رہتے ہیں اور ہمیشہ امید اور روشنی کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کا نثری ترجمہ پڑھ لیجیے:

''جو لوگ دولت کی لالچ میں آکر وطن کے مفاد کو نظر انداز کر جاتے ہیں، وہ ملک پر کلنک کا ٹیکا ثابت ہوتے ہیں، دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی ایک دن مرنا ہوتا ہے لیکن مرنے کے بعد وہ بدنامی کے داغ کبھی نہیں دُھل پاتے، لوگ ان کے مرنے پر روتے نہیں، میری اس بات میں رتّی بھر جھوٹ نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں اور تاریخ میری اس بات کی گواہی دے رہی ہے۔

مدھوکر کی ہر نظم میں رجائیت کا بھرپور جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس کی بنیادی وجہ انسانیت پر مدھوکر کا یقین کامل ہے، اس کے کلام میں حرکت وحیات اور جوش وخروش کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری میں واقعی شاعرانہ حسن ہے، نکھار ہے۔

میں جب مدھوکر سے ملا وہ ریڈیو کی نوکری چھوڑ چکے تھے اور ان کا زیادہ وقت ان کے دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا، ان کے ایک گہرے اور قریبی دوست پروفیسر مدن موہن شرما تھے، جو ڈوگری کے معروف افسانہ نگار ہیں لیکن اب ادب اور ادبی محفلوں سے دور رہتے ہیں۔ میں جب بھی مدھوکر سے ملا تو پروفیسر شرما اور ودیا رتن (چتر کار) اکثر ان کے ساتھ ہوتے تھے، وہ جب کسی ادبی مسئلے پر اُلجھ جاتے اور ڈوگری زبان کا سہارا لے کر ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تو میں چپکے سے چلا آتا۔

مدھوکر کو مرے ہوئے اب بہت سال ہو چکے ہیں۔ لیکن ڈوگری شاعری میں اُن کا نام آج بھی زندہ ہے اور کل بھی زندہ رہے گا۔ بقول وید راہی ڈوگری شاعری کا جدید دور پنت سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ پنت جی سے پہلے بھی بہت سارے شاعروں نے بنا کسی نام و ناموس کے ڈوگری شعروشاعری کے سرسبز میدان میں رنگ رنگ کے پھول اُگائے۔ دینو بھائی پنت محکمہ دیہات سدھار میں ملازم تھے اور بحیثیت ڈسٹرکٹ پنچایت آفیسر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ پنت جی کا پہلا مجموعہ کلام ''گتلوں'' کے نام سے شائع ہوا۔ عوام نے ایک نئی آواز کا سواگت کیا۔ شروع شروع میں انہوں نے مزاحیہ نظمیں لکھیں لیکن جلد ہی پنت جی نے سنجیدہ نگاہی سے کام لیا اور اپنے فن کو عوام دوستی کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ لوگوں کے دکھ درد کا مداوا انہیں ہنسا کر وقتی طور بے نیاز کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ انہیں دکھ درد کا احساس کرا کر اس کے خلاف ایک جدوجہد شروع کرنے میں ہے۔

ایک مسلسل جدوجہد، ایک منظّم تحریک اور انقلاب کے نعرے میں عوام کی مصیبتوں کا حل پوشیدہ ہے۔ اس کے لئے پنت جی نے علمی طور پر کام کرنا شروع کیا۔ 1945ء میں جاگیر چنینی کے راجہ کے خلاف عوامی تحریک میں انہوں نے جو رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

''اس بے کار نظام میں اب ایسے گذارہ نہیں ہوگا کہ
رو رو کر کام کر کر کے مرتے رہو، اس نظام کو بدلے بنا کوئی چارہ نہیں،
دکھوں سے کالی ہوئی دیواروں پر امیدوں کے رنگ و روغن سے کیا
حاصل، اب یا تو ادھر ہو جاؤ یا اُدھر، دوسروں کا راستہ مت روکو۔''

❁ ❁ ❁

44

آواز کا جادوگر

آواز کے جادوگر محمد رفیع کو انتقال کئے اب تیس برس ہو چکے ہیں، وہ 31 رجولائی 1978ء کو ممبئی میں انتقال کر گئے تھے، تیس برسوں میں ایک نسل جنم لیتی ہے، ایک نسل جوان ہوتی ہے۔ ایک نسل بوڑھی ہو جاتی ہے اور ایک نسل مر جاتی ہے لیکن اس جینے اور مرنے کی دوڑ میں محمد رفیع کو ہم آج بھی اپنی آواز کی بدولت آس پاس ہی دیکھتے ہیں، اُن کی آواز کا جادو آج بھی زندہ ہے، شوخ چنچل گیتوں کے ساتھ ساتھ درد بھرے گیتوں کی فضا بھی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے...... کہتے ہیں نا کہ ''مجھ کو میرے مرنے کے بعد زمانہ ڈھونڈے گا۔''

جن لوگوں کو محمد رفیع سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کے قریب جانے کا موقعہ ملا ہے وہ کہتے ہیں کہ محمد رفیع ایک بلند پایہ کے گلوکار ہی نہ تھے بلکہ ایک بہت اچھے اور پُر خلوص انسان بھی تھے۔ فلمی دنیا کے گیسٹ بوائے سے لیکر فلم ڈائریکٹر تک وہ اپنی شرافت اور نفاست کے لئے جانے جاتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ محمد رفیع کو بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا مگر اُن کے والد کو اپنے بیٹے کے اس شوق سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اُن کے بھائی محمد حامد حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے تھے۔ رفیع صاحب نے اپنی زندگی کا پہلا گانا اُس زمانے کے معروف و مقبول گلوکار کندن لعل سہگل کی موجودگی میں گایا تھا اور آنجہانی سہگل نے رفیع صاحب کی آواز کی تعریف کی تھی۔

موسیقار شیام سندر کی موسیقی میں محمد رفیع نے 1941ء (شاید فروری) میں اپنی آواز میں پہلا گانا فلم ''گل بلوچ'' کے لئے ریکارڈ کروایا تھا، یہ فلم پنجابی

زبان میں بنی تھی۔ فلم گاؤں کی گوری اُن کی پہلی اُردو زبان میں بننے والی فلم تھی جس میں انہوں نے اپنا پہلا گانا ریکارڈ کروایا تھا۔ یہ 1942ء کی بات ہے موسیقار نوشاد علی کے ساتھ محمد رفیع کے تعلقات بہت بہتر تھے۔ 1944ء میں نوشاد صاحب نے محمد رفیع کو فلم "پہلے آپ" کے ایک کورس میں شامل کیا تھا۔ گانے کے بول تھے۔

"ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا"

اس کے بعد محمد رفیع نے پلٹ کر نہ دیکھا لیکن یہ بات شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ روزانہ کم سے کم دو گھنٹے ریاض کرتے تھے...... فلم بیجو باورہ اپنی موسیقی کے لئے آج بھی فلم سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہنوں میں زندہ ہے، یہی وہ فلم ہے جس کی بدولت محمد رفیع کو انتہائی شہرت حاصل ہوئی اور اُن کے کیریئر کو بنانے میں اس فلم نے ایک اہم رول ادا کیا۔

دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے

محمد رفیع اور لتا منگیشکر کی جوڑی بہت مقبول جوڑی تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں نے مل کر سب سے زیادہ "دوگانے" گائے اگرچہ درمیان میں ایک مختصر سے وقت کے لئے اُن دونوں میں اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے لیکن موسیقار جے کشن کی کوششوں سے دونوں میں صلح ہوگئی تھی اور انہوں نے دوبارہ ایک ساتھ گانا شروع کر دیا تھا۔ اُنہوں نے 33 سال تک مل کر گانے گائے۔ فلمی دنیا میں یہ طویل عرصہ ایک تاریخی نوعیت کا حامل ہے اور اس کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ لتا منگیشکر محمد رفیع کو ایک لاثانی گلوکار تسلیم کرتی ہیں۔

محمد رفیع نے اپنی حیات کے دوران نئے پرانے اداکاروں کے لئے گانے گائے۔ ان میں دلیپ کمار، سنیل دت، دھرمیندر، راجندر کمار، بھارت بھوشن، دیو آنند، شمی کپور وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کشور کمار جو خود ایک بہت

چھے گلوکار تھے، کی فلموں کے لئے بھی رفیع صاحب نے اپنی آواز دی اور یادگاری گانے پیش کیے۔

محمد رفیع کی آواز کا جادو ان کی زندگی میں جس طرح سامعین کے دل و ذہن پر حاوی تھا وہ جادو اُن کے جانے کے بعد بھی قائم ہے۔ اتنا عرصہ گذرنے کے بعد فلم انڈسٹری بہت ساری کوششوں کے بعد بھی دوسرا محمد رفیع پیدا نہ کرسکی۔ یہ اُن کی آواز اور اُن کی شخصیت کا ایک روشن پہلو ہے۔

1941ء سے لے کر 1978ء تک فلمی دنیا میں جتنے بھی موسیقاروں نے جنم لیا، قریب قریب اُن سب کے ساتھ محمد رفیع نے اُن کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں گانے کی سعادت حاصل کی اور ان اَنگنت اور بے شمار گانوں میں محمد رفیع مرحوم کی آواز آج بھی زندہ ہے، امر ہے اور آنے والے موسموں میں بھی زندہ رہے گی، امر رہے گی......!!!

۞۞۞

45

کس نے مقالہ لکھا ہے کس کے نام سے

تقسیم ملک کے بعد جن قلمکاروں نے اُردو طنزیہ ومزاحیہ ادب کی آبرو رکھ لی، ان کی فہرست طویل ہے۔ بہت عرصہ بیتنے کے بعد بھی جب ہم اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس عظیم ورثہ کہ ایک تصویر سامنے اُبھر کر آتی ہے۔ اس تصویر کے کئی رنگ ہیں، کئی روپ ہیں اور یہ رنگ و روپ اپنے وقت کے معروف و مقبول طنز نگار احمد جمال پاشا نے اپنے ایک مضمون میں نہایت متانت اور شائستگی کے ساتھ اُبھارے ہیں۔ یہ مضمون سہ ماہی ''کامران'' (اپریل۔ جون 1961)، سرگودھا پاکستان میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے 1947ء سے 1960ء تک طنزیہ ومزاحیہ ادب کے تقریباً ہر پہلو کا ایک مختصر سا جائزہ لیا ہے۔ احمد جمال پاشا کا اپنا ایک انداز تحریر رہا ہے، ان کا یہ مخصوص انداز تحریر اس مضمون میں بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے طنز ومزاح کے شہواروں یا علمبرداروں کے خدوخال با مقصد پیرائے میں پیش کئے ہیں۔ اس مضمون میں چند نام ایسے بھی ملتے ہیں جو شاید اب اُردو ادب سے تعلق رکھنے یا محبت کرنے والوں کے ذہنوں سے اُتر چکے ہونگے اور شاید نئی نسل کے لئے کچھ نام پہلی بار سامنے آئیں گے۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں احمد جمال پاشا کے مجموعی تاثرات کو مختصر کر کے اپنے انداز میں قلم بند کر رہا ہوں۔

لکھتے ہیں:

''تقسیم عظیم کے بعد نظم کے میدان میں سب سے زیادہ قابل ذکر نام سید محمد جعفری کا ہے۔ جعفری عموماً ملکی مسائل پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ اکبر اور ظریف کے بعد اُردو کی مزاحیہ شاعری میں سب سے بلند مقام

رکھتے ہیں۔ شوکت تھانوی چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنے طنز کا
نشانہ بناتے ہیں۔ اسد ملتانی کا مزاحیہ کلام ان کے سلیقے کی عکاسی کرتا
ہے۔ شاد عارفی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بہت کہنہ مشق ہیں اور
ان کے طنز میں شعلے کی لپک ہے۔''

مجید لاہوری کے یہاں گرمی بازار کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ہنگامی موضوعات پر لکھنے پر قادر ہیں، مجید ہنگامی آدمی تھے، ان کے یہاں وقتی موڑ کی پیداوار عام ہے، اُردو کی طنزیہ شاعری میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ فرقت کاکوروی کا میدان تحریف ہے ان کی نظم ''کتوں کا مشاعرہ'' ظرافت کے لحاظ سے کافی مقبول ہوئی۔ عبدالمجید بھٹی نے بھی ظرافت کے میدان میں اچھا خاصا کام کیا۔ رئیس امروہی بہت قادر الکلام اور پُر گو شاعر ہیں، ان کی نظمیں بھی طنز و مزاح کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ضمیر جعفری کے موضوعات میں ندرت، تیکھاپن اور سلاست ہے منور آغا اور مجنون لکھنوی اُردو کے بہترین مزاحیہ شاعر ہیں۔ مجنون بہت کم کہتے مگر بہت اچھا کہتے ہیں، وہ ہر غیر متوازن چیز کا بہت گہرا اثر لیتے ہیں اور پھر اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔

احمق پھپھوندی اور حاجی لق لق تقسیم کے بعد تقریباً بجھ گئے اُن کی طنز کی شدت یکسر مفقود ہوگئی۔ تقسیم سے پہلے انہوں نے معرکے کی چیزیں لکھی تھیں۔ راجہ مہدی علی خان کی طنزیہ نظمیں زندگی اور سماج کے مریضانہ کیفیتوں کے خاکے ہیں، راجہ صاحب کو موضوعات پر قدرت ہے، مزاحیہ شاعری میں واہی کا نام بہت اہم ہے۔ ان کی تحریفات بھی کامیاب ہوئی ہیں وہ ہر قسم کے سیاسی سماجی اور دوسرے موضوعات پر بے تکان کہتے ہیں۔ ان کا ایک شعر زبان زد اور ضرب المثل ہے۔

دلی جا کے کون پوچھے مالک رام سے
کس نے مقالہ لکھا ہے کس کے نام سے

اے ڈی اظہر اور ظریف جبلوری اہم ہیں۔ اے ڈی اظہر اچھے مزاحیہ شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے یہاں فن کی جانب خاصی توجہ ملتی ہے۔

قاضی غلام محمد کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی تحریف نگاری قابل داد ہے۔ وہ غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔

جس طرح اُردو شاعری کا دوسرا نام غزل ہے اسی طرح اُردو نثر میں مزاح نگاری کا دوسرا نام مضمون نگاری ہے۔ تقسیم ملک کے بعد تخلیق کے سوتے بند نہیں ہوئے، پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے لکھنے والے بھی آئے...... رشید احمد صدیقی کے یہاں الفاظ کی بازی گری اور فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ ذہانت اور بزلہ سنجی کی فراوانی ہے، تمکین کاظمی ابھی بھی لکھ رہے ہیں اور تازہ دم ہیں، پطرس مرحوم کا انداز سب سے جداگانہ ہے، ان کی ظرافت بہت سنبھلی ہوئی ہے۔ اُردو میں خالص ظرافت کے یہ سب سے بڑے علمبردار ہیں ان کا قاری بننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ شوکت کے مضامین میں اعلیٰ مذاق کے ساتھ ساتھ الفاظ و لطائف سے مزاح پیدا کرنے کی شعوری کوشش ملتی ہیں، مالک مرحوم بہت اچھے طنز نگار تھے۔ ان کے یہاں طنز بھر پور طریقے پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

چودھری محمد علی رودولوی بہت بڑے صاحب طرز انشاء پرداز تھے، مرحوم کے مضامین میں ہمارے ادب کے لئے خاصے کی چیزیں ہیں، ان کی شگوفہ بازی میں زبان کے چٹخارے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر سرجن کی جراحی کا عمل بھی شامل ہے۔ کنہیالال کپور کا طنز بہت اعلیٰ درجے کا ہے۔ ان کے طنز کا دائرہ زندگی اور سماج کے عدم توازن اور بے ڈھنگے پن کا احاطہ کرتا ہے، فکر تونسوی کے یہاں طنز و ظرافت میں حسن و امتزاج کی کمی کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ تلخی آ گئی ہے، ان کا لہجہ تند و تیز ہے۔

منٹو مرحوم بہت بڑے طنز نگار تھے، وہ تیر چلانے کے بجائے بمباری کرنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے سماج کے گھناونے پہلوؤں کی نقاب کشائی بڑی مصوری اور بے دردی کے ساتھ کی ہے۔

مجید لاہوری، کرشن چند، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، غلام عباس اور ابراہیم جلیس میں عصمت اور کرشن کے یہاں طنزیہ لہجہ زیادہ کامیابی کے ساتھ نمایاں ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

اُردو طنزیہ ومزاحیہ ادب

شفیق الرحمان اپنے مزاج کا مواد الفاظ کی ناہمواری اور لطائف کے صحیح استعمال سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے بعض مضامین دراصل لطائف کی ایک زنجیر ہے جس سے وہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاتے ہیں۔ وزیر آغا کے یہاں علم و متانت دونوں کا حسنِ امتزاج ہے وہ اپنے مضامین میں خیالات پر قادر ہیں۔ آوارہ حیدر آبادی اور ناکارہ حیدر آبادی کو زبان و بیان پر حیرت انگیز طریقے پر عبور حاصل ہے۔ محمد اختر خالہ اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں، اے حمید بھی اس میدان کے پرانے شہسوار ہیں، مشتاق احمد نئے لکھنے والوں میں اہم ہیں، ان کا انداز بہت پھیلا ہوا ہے۔

شفیق عقیل ہونہار طنز نگاروں میں سے ہیں، ان کے یہاں نیا پن ہے، امجد حسین بھی خاصے اہم مزاح نگار ہیں، وجاہت حسین سندیلوی کی زباں رواں دواں ہے، ان کے طنز میں بے ساختگی ہے، اے۔ آر ممتاز کے قلم میں بجلیاں پوشیدہ ہیں، ماہ منیر خان اپنے طنز و مزاح کا مواد اپنے گھر، بال بچوں اور خاندان سے حاصل کرتے ہیں، یوسف ناظم کا مزاح بہت بالغ اور شعوری ہے، رشید الدین کے یہاں طنز و مزاح کی فراوانی ہے۔ تخلص بھوپالی کا قلم سرشار کی طرح بے نیاز ہے۔

انشاء نگاری کے میدان میں میر ناصر علی نے جس روایت کی بنیاد ڈالی تھی ،اس کے مستقبل کے امکانات روز بروز روشن ہوتے جارہے ہیں۔ نظیر صدیقی بھی بہت خوب لکھتے ہیں۔

خاکہ نگاری کا فن خاصا ترقی کر رہا ہے۔اس میدان کے شہسواروں میں چودھری محمد علی اور مرزا محمود بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔

تقسیم کے بعد طنزیہ اور مزاحیہ ناول بہت کم لکھے گئے ہیں، شوکت تھانوی کے مزاحیہ ناول خاصے مقبول ہیں مگران کے یہاں ماحول، واقعات، کردار اور پلاٹ کی یکسانیت اُکتا دینے کی حد تک ہے۔ کرشن چندر کی ''گدھے کی سرگزشت'' اور ''الٹا درخت'' اس عہد کے بہترین طنزیہ ناول ہیں۔ عادل رشید کا ''میر صاحب''، علی عباس حسینی کا ''حکیم بابا'' اور محمد خالد اختر کا ''1984ء'' اس سلسلہ کی کامیاب کڑیاں ہیں۔

صحافتی مزاح کے سلسلے میں بیسویں صدی میں خوشتر گرامی کے تیر ونشتر، صدقِ جدید میں عبدالماجد کی سچی باتیں، جنگ میں شوکت تھانوی کا پیاز تلے، قومی آواز میں حیات اللہ انصاری کی گلوریاں، جنگ کراچی میں ابراہیم جلیس کا وغیرہ وغیرہ، ملاپ میں فکر تونسوی کی پیاز کے چھلکے، مجید لاہوری کا نمکداں، امروز میں احمد ندیم قاسمی کا پنج دان، زمیندار میں نغمی کا فکاحیہ کالم اور آفاق میں انتظار حسین کا کالم خاصے مقبول ہیں۔

خطوط شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں، ان میں فنکار کی شخصیت مکمل طور پر سامنے آتی ہے۔ نیاز فتح پوری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ بیگم زینت کوثر دہلوی کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

تراجم کی جانب بھی توجہ دی گئی مگر بہت کم، شاہد احمد دہلوی، سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، خالد اختر اور احمد عباس کے نام قابل ذکر ہیں۔

بچوں کے ادب کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے طنز ومزاح کی خوشگوار آمیزش ہمیشہ ضروری اور مفید سمجھی گئی ہے۔ حامد اللہ افسر، اطہر پرویز، شفیع الدین نیرّ، شمیم اہنونوی، الیاس دہلوی اور سراج انور کے نام قابل ذکر ہیں۔

رسائل ہمیشہ خاص طور پر طنز و مزاح کی ترویج و اشاعت میں دلچسپی لیتے رہے ہیں، علی گڑھ میگزین، نقوش، بھائی بھائی، نمکداں، چاند، پھلجھڑی، اودھ پنچ اور پاک پنچ مزاحیہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

یہ تھا احمد جمال پاشا کے مضمون کے پسِ منظر میں اُردو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ایک مختصر سا تعارف...... 1960ء کے بعد اس کارواں میں نئے شہسوار نظم ونسق کے گھوڑوں پر سوار ہو کر طنز و مزاح کے میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں...... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئی نسل بھی باشعور ہے اور مقصدی ظرافت کی پابند تھی......!!

❁❁❁

چار دوستوں کا ایک گھر

1967ء میں ماہنامہ دیہات سدھار کے مدیر کی حیثیت سے میری پوسٹنگ سول سکریٹریٹ (ایگری کلچر اینڈ کمیونٹی ڈیولپمنٹ ونگ) میں ہوئی اور اس طرح میں بھی دربار موکا ایک باقاعدہ ممبر بنا۔ اُس زمانے میں بہت کم کشمیری اپنی فیملی کے ساتھ جموں جاتے تھے، چند دوست یا چند دفتری ساتھی مل جل کر ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھ ماہ کے لئے ایسے بہت سارے عارضی گھروں کا قیام عمل میں آتا تھا لیکن میں جس عارضی گھر یا مس (Mess) کی بات کر رہا ہوں، اس کی اپنی ایک افادیت تھی۔ ایک گھر میں جو چار لوگ یا چار دوست رہتے تھے ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کشمیری پنڈت۔ چاروں اسمبلی سکریٹریٹ میں مختلف عہدوں پر فائز تھے اور چاروں اپنے سیاسی نظریے کی وجہ سے مرحوم جناب غلام محمد صادق کے قریب تھے۔ یہ چار لوگ تھے:

اخترِ محی الدین، سوم ناتھ زتشی، مہندر رینہ اور محمد یوسف ڈار۔

اُن کی آپسی محبت، خیالات کی ہم آہنگی اور ان کا بھائی چارہ اُن کی دوستی کی بنیاد تھی، ہندو مسلم اتحاد کی ایک زندہ مثال تھی۔

اب زمانہ بدل چکا ہے، خیالات بدل چکے ہیں، صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ اس کالم میں پہلے ہی اختر محی الدین اور مہندر رینہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں، آج سوم ناتھ زتشی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

سوم ناتھ زتشی 16 رمئی 1923ء کو سرینگر کے محلہ روگناتھ مندر میں پیدا ہوئے، سرینگر میں ہی پلے بڑھے اور تعلیم حاصل کی۔ شروع شروع میں جموں سے

شائع ہونے والے بچوں کے میگزین ''رتن'' کے لئے لکھتے رہے لیکن ان کا پہلا اُردو افسانہ اخبار ''مارتنڈ'' میں اگست 1937ء میں شائع ہوا۔

1941-42ء میں جب کشمیر میں Progresive Writers League کی بنیاد پڑی تو زتشی صاحب نے ایک اہم اور سرکردہ کارکن کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ جب 1951ء میں رسالہ کونگ پوش کا اجرا ہوا تو زتشی صاحب مدیر مقرر ہوئے، ان کی پہلی کشمیری کہانی ''پیلہ پھول گاش'' اسی جریدے میں شائع ہوئی۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی لکھا، خاص طور سے ڈرامے...... 1955ء میں ان کا تحریر کردہ کشمیری ڈرامہ ''وجِہ واد'' کو آکاش وانی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کا ریڈیو کے لئے تحریر کردہ ڈرامہ ویتھ روزِ پکان، آج بھی کشمیری میں لکھے گئے ڈراموں میں ایک نمایاں مقام کا حامل ہے۔ 1947ء میں لکھا گیا۔ ان کا اُردو ڈرامہ ''محاذ پر لڑیں گے ہم'' بھی قابل ذکر ہے۔ وہ کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں افسانے لکھتے تھے۔ حالانکہ بعد میں انہوں نے اپنی مادری زبان کشمیری کو اپنالیا۔

روسی زبان کا مقبول ڈرامہ ''انسپکٹر جنرل'' کا ترجمہ کرنے پر آنجہانی زتشی کو سویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فرانسیسی ناول نگار کافکا کے مشہور ناول ''دی ٹرائل'' کا کشمیری زبان میں ترجمہ کرنے کا سہرا بھی زتشی صاحب کو جاتا ہے۔ ان کے کشمیری افسانوی مجموعہ ''پیلہ پھول گاش'' پر ان کی وفات کے بعد ریاستی کلچرل اکادمی کی جانب سے انعام دیا گیا۔ ریاستی کلچرل اکادمی ہر سال بہترین کتابوں کے لئے ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے مصنفین کو نقد انعام سے نوازتی ہے۔

سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے ہی وہ کشمیر اڈمنسٹریٹو سروس میں آگئے تھے اور بحیثیت ڈپٹی سکریٹری رٹائر ہو گئے۔

ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں جتنی بھی ادبی انجمنیں موجود ہیں ان کے فروغ اور ان کی بہتری کے لئے ایک اہم رول ادا کیا۔ وہ کلچرل فرنٹ اور کلچرل کانگریس کے بنیادی ممبروں میں سے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی ان کی وابستگی تھی۔

9 ستمبر 1996ء کو 73 برس کی عمر میں بنگلور میں ان کا دیہانت ہوگیا اور اس طرح کشمیری زبان وادب کا ایک اور عظیم افسانہ نگار ہم سے بچھڑ گیا۔

محمد یوسف ڈار اور مہندر رینہ زتشی صاحب سے پہلے ہی اس دنیا سے چلے گئے تھے۔ زتشی صاحب کے بعد اختر محی الدین بھی چلے گئے......اور ہماری نظروں سے بہت دور ان چار دوستوں نے ایک اور گھر بنالیا ہے ایک مستقل گھر......!!

❁❁❁

48

ترے رُخ سے روشن ہوا سب جہاں

ضلع شوپیاں کا ایک چھوٹا سا گاؤں پنجورہ اپنی علمی اور دینی دولت سے مالا مال ہے۔ اس گاؤں میں 18 / مارچ 1924 ء کو محمد عبداللہ ملک کے گھر میں غلام محمد ملک کا جنم ہوا۔ اس وقت کسی کو بھی اس بات کا احساس نہ تھا کہ آنے والے دنوں میں غلام محمد ملک شوریدہ کاشمیری کا نام اپنا کر نہ صرف ریاست جموں و کشمیر میں بلکہ پورے برصغیر میں ایک استاد اور ایک شاعر کی حیثیت سے چھا جائے گا۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم پنجورہ اور شوپیان کے اسکولوں سے حاصل کی۔ پھر اسلامیہ ہائی سکول میں سرینگر داخلہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامیہ ہائی سکول میں پنجاب اور کشمیر کے بہترین اساتذہ تعینات تھے۔ ملک صاحب کو اسی زمانے میں اُردو شعر و ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ 1941 ء میں میٹرک پاس کیا پھر ایس پی کالج میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد تاثیر کالج کے پرنسپل تھے، وہ شوریدہ صاحب کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ایف۔ اے کا امتحان 1943 ء میں پاس کیا اور پھر امر سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ امر سنگھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں نمائش گاہ میں منعقد ایک مشاعرہ میں حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ امر سنگھ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عبدالحلیم نے ان کی غزلیں سن کر مسرت کا اظہار کیا۔

بی۔ ایڈ (اس زمانے کا بی ٹی) کا امتحان پاس کرنے کے بعد شوریدہ صاحب گورنمنٹ ہائی سکول شوپیان میں بحیثیت استاد تعینات ہوئے۔ اسی دوران 56-1955 ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ اے (اُردو) کا امتحان پاس کیا اور پھر اننت ناگ کالج میں اُردو لیکچرار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ باقاعدگی کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے بلکہ اس بات کا خود شوریدہ کاشمیری نے اعتراف کیا ہے کہ شعر گوئی میں نہ تو کسی کی تقلید کی اور نہ ہی کسی مکتبہ فکر سے وابستہ رہے۔ البتہ میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا غالب اور علامہ اقبال سے کافی متاثر تھے، وہ فرماتے تھے کہ شعر ایک حساس آدمی کے لئے اپنے احساسات کا اظہار ہے۔

ایک حساس آدمی کے لئے روزمرہ زندگی میں ہونے والے واقعات، حالات، حادثات، تصورات، مشاہدات اور تجربات ایک مخصوص نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپش شوق نے ہر زرہ پر ایک دل باندھا

ان کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''جوش جنون'' تھا جو 1980ء میں شائع ہوا۔ اس شعری مجموعے کی اشاعت سے وہ اپنا نام روشن کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ تھی، ان کے مشاہدے اور جذبے کی دیانت داری، ان کے لہجے کی سادگی اور اپنی روایات کا تحفظ۔ شوریدہ صاحب کا اپنا ایک منفرد اندازِ بیان تھا۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا تھا
میرا سرِ دامن بھی ابھی تک تر نہ ہوا تھا

شوریدہ کاشمیری کے دوسرے مجموعے کا نام تھا ''جذب دروں'' یہ 1986ء میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو جوش جنون سے جذب دروں تک پہنچتے پہنچتے بہت منازل طے کرنا پڑے ہیں۔ ان کا اسلوب صوفیانہ اور لہجہ معتبر ہو گیا ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں تخیل کی بلندی، مشاہدات کی تازگی، جذبات کی شدت، انسانی ہمدردی اور اخوت کے جذبے صاف صاف نظر آنے لگے ہیں۔

لو تماشائی ہے ہر زخم شہید
پیچ و خم کیا بازوئے قاتل میں ہے

یوں تو میں شوریدہ کاشمیری کو ذاتی طور پر بہت کم جانتا تھا لیکن کئی مشاعروں میں انہیں کلام پڑھتے ضرور دیکھا تھا۔ ان کی آواز یا یوں کہئے ان کے لہجے میں اپنا ایک انداز تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر رُک رُک کر بات کرتے تھے۔ شاعر تو وہ ایک اعلیٰ پائے کے تھے ہی، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بہترین استاد بھی تھے اور بحثیت ایک استاد کے بھی ان کا ایک نام تھا۔ ان کی عزت تھی۔

1973ء میں میں نے ان کی ایک غزل ''انتخاب اُردو ادب'' میں شامل کی تھی۔

خاک پاک و وطن ہے مردم خیز
یہی شیرازہ ہے یہی تبریز

یہ شعر دیکھئے۔

صورتوں کے بدل دیئے رنگ
وقت بھی ہے ایک طرح کارنگریز

جوش جنوں اور جذب دروں کے بارے میں ریاست کے معروف شاعر اور نثر نگار غلام نبی ناظر لکھتے ہیں:

''ایک صاف دل، اخلاص و دردِ دل کے پتلے، ماہر زبان و رموز شعر اور ایمان و آگہی سے مالا مال ایک شاعر رنگین نوا کا تخلیقی سرمایہ ہے جس کو عزت و احترام کے ساتھ اور مخلص تخلیق کار کی حیثیت بہت دیر تک یاد رکھا جائے گا۔''

یہ شعر بھی دیکھ لیئے۔

توڑ دی پڑھ کر نماز اس کی کریز
میں نے پتلون کو مسلمان کر دیا

پائجامہ کر کے ہی چھوڑا اسے
رام شاید نفسِ شیطان کر دیا

شوریدہ کاشمیری 18 اپریل 1991ء کو انتقال کر گئے۔

٭٭٭

49

چند یادیں چند باتیں

اس کالم میں اُن شخصیتوں کو یاد کیا جاتا ہے جو ہم سے بچھڑ چکے ہیں لیکن آج اُن کی بات کرنے سے پہلے میں لتا منگیشکر کا نام لینا چاہتا ہوں جو ابھی حیات ہیں، اُن کی پُرسوز اور پُر درد آواز زندہ اور جاوداں ہے۔ یہ آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اُن کی آواز کا لوچ بتاتا ہے کہ آواز کی بھی ایک صحت ایک تندرستی ہوتی ہے وہ سنگیت کی دنیا میں ایک انجمن بن چکی ہیں۔ وہ ہندوستانی موسیقی کی سب سے کامیاب اور بے مثل مغنیہ ہیں اور بقول مجروح سلطان پوری ؎

تری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیر
ہاتھ میں ترے ہی گیتوں کی حنا ہو رخشاں

اور اب بات ہوگی اُن چند موسیقاروں کی، جنھوں نے لتا جی کی آواز میں اپنی موسیقی سے جان ڈال دی اور وہ فلمی دنیا کی ایک ایسی آواز بن گئی جس پر سب کو ناز اور فخر ہے..... نوشاد علی، غلام حیدر، اٹل بسواس، شیام سندر، جے کشن (شنکر جے کشن جوڑی)، سی رام چندرن، لکشمی کانت (لکشمی کانت پیارے لعل کی جوڑی) اور بھی بہت سارے موسیقار..... کیا کہتی ہیں لتا جی اپنے اُن ساتھیوں کے بارے میں جو کبھی اُس کے ہم سفر تھے ہمراہ تھے اور اب،..... اس دنیا سے اُٹھ کر ددوسری دنیا میں چلے گئے ہیں، ایک ایسی دنیا میں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا!!

مرحوم نوشاد علی کے بارے میں..... وہ اپنی دُھنوں کا ہر پہلو سے اچھی طرح جائزہ لیتے تھے اور گانے کے بول کے تعلق سے بھی بہت محتاط رہتے تھے۔ وہ

جانتے تھے کہ کون سا ساز کب اور کہاں استعمال کرنا ہے؟ اُن میں شعر سمجھنے کی صلاحیت تھی، وہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ اور غلام حیدر اپنے نغموں کی دُھنیں بغیر کسی پریشانی کے تیار کرتے تھے، وہ پہلے سنگر کی آواز سنتے تھے، سوچتے تھے پھر اُس کی آواز کے مطابق دُھن تیار کرتے تھے۔

اور لتا جی کے مطابق غلام محمد بھی اپنے زمانے، اپنے وقت کے ایک بہتر موسیقار تھے۔ انہوں نے فلمی دھنوں کے سلسلے میں کئی تجربے کیئے اور کامیاب رہے۔

اٹل بسواس کے بارے میں لتا جی کہتی ہیں:

''وہ ایک ایسے موسیقار تھے جو کلاسیکی اور لوک موسیقی سے جڑے ہوئے تھے بنگلہ موسیقی کو اُن سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا۔ اُردو شاعری سے بھی وہ بخوبی واقف تھے اور اُن کی معلومات کافی بہتر تھیں۔''

شام سندر بھی ایک معروف فلمی موسیقار تھے۔ اُن کے بارے میں لتا جی نے کہا ہے:

''شام سندر کی موسیقی میں غنائیت اور انفرادیت ہوتی تھی۔''

ایک اور موسیقار کھیم چندر پرکاش کے بارے میں لتا منگیشکر کی رائے:

''موسیقی اُن کے لئے ایک فن تھا، پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں۔''

بقول لتا جی آنجہانی جے کشن کی موسیقی ہمیشہ جوانی، مسرت اور بہار سے عبارت رہی ہے اور لکشمی کانت کی بنائی ہوئی دُھنوں میں اپنا ایک الگ رنگ نمایاں ہوتا تھا۔

سی رام چندرن بے چند محنتی تھے۔ وہ ایک اچھے گلوکار بھی تھے اور لتا جی اُن کی ترتیب دی ہوئی موسیقی سے مطمئن ہوتی تھیں۔

یہ سارے موسیقار اپنے زمانے کے معروف و مقبول موسیقاروں میں

شمار ہوتے تھے، اُن کی موسیقی میں لتا جی نے جتنے بھی گانے گائے ہیں وہ آج بھی نہایت ہی دلچسپی سے سنے جاتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں۔

آنجہانی او پی نیئر بھی اپنے زمانے کے مقبول ترین موسیقاروں میں سے تھے لیکن لتا جی نے اُن کے لئے کوئی گانا ریکارڈ نہیں کروایا یوں کہئے کہ نیر صاحب نے لتا جی کی بے حد رسیلی آواز کا استعمال نہیں کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ لتا جی کی آواز اُن کی موسیقی کے سرتال کے لئے مناسب نہیں۔

موسیقار سنیل چودھری بھی لتا جی کے پسندیدہ موسیقاروں میں سے تھے۔ لتا جی نے مدن موہن کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں جو غزلیں گائیں خاص طور سے راجہ مہدی علی خان کی تحریر کردہ غزلیں...... اُن کے بارے میں لتا جی کا کہنا ہے کہ مدن موہن ایک سلجھے ہوئے موسیقار تھے۔ وہ غزل کے موسیقار تھے۔

خود لتا منگیشکر کے پتا دینا ناتھ منگیشکر ایک بہت بڑے سنگیت کار تھے۔

حسن لعل بھگت رام کی جوڑی بھی چوٹی کے موسیقاروں میں شمار کی جاتی تھی اس جوڑی نے بھی لتا جی کی آواز کا بھرپور استعمال کیا اور موسیقی کے اعتبار سے ان کی فلمیں ہٹ ہو گئیں۔

اور بھی کئی موسیقار ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں لتا جی کی آواز کو اپنی رس بھری موسیقی سے سنوارا۔ اُن کے نام ذہن میں نہیں آرہے ہیں لیکن آج بھی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود لتا منگیشکر اپنی آواز سے زندگی کی تلخی میں مٹھاس گھول رہی ہیں اور وہ نئے نئے موسیقاروں کو اپنی آواز دے کر امر بنا رہی ہیں، ایک نام دے رہی ہیں، کبھی نہ مٹنے والا نام......!!

دیپک بغیر کیسے پروانے جل رہے ہیں
کوئی نہیں جلاتا اور دیپ جل رہے ہیں
آئے گا...... آئے گا...... آنے والا......!!!

❁ ❁ ❁

50

اکبر ہماری محفل میں

چند روز قبل ایک اخبار کے دفتر میں اکبر جے پوری کا ذکر چل پڑا، میرے ایک اخبار نویس دوست شجاع کشمیری نے بتایا کہ اکبر جے پوری کو اپنے قلم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنی لکھی ہوئی تحریر کی کبھی تصحیح نہیں کرتے تھے لیکن لکھنے سے پہلے بہت سوچتے تھے بلکہ اپنی سوچوں میں غرق ہو جاتے تھے۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی حالانکہ میں ان سے بخوبی واقف تھا، ان کی عزت کرتا تھا، ان سے کبھی کبھار ملاقاتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اکبر جے پوری کا اصل وطن جے پور (راجستھان) ہے لیکن اس بات کی تردید انہوں نے یہ کہتے ہوئے کی کہ ان کے آباواجداد کشمیری نژاد ہیں اور حسن آباد سرینگر ان کا آبائی علاقہ ہے۔ دراصل ان کے والد محترم آغا سید علی عابد بسلسلہ روزگار وادی سے باہر راجستھان چلے گئے تھے اور جے پور میں عارضی طور پر سکونت اختیار کی تھی اکبر علی جے پور میں ہی پیدا ہوئے اور اس طرح جے پوری ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا، وہ اکبر علی سے اکبر جے پوری بن گئے۔ کشمیر آ کر وہ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ریاست میں معروف اور نامور ماہر تعلیم خواجہ غلام الدین ناظم تعلیمات ہوا کرتے تھے۔ اپنی سکبدوشی تک وہ تعلیم کے شعبہ سے ہی منسلک رہے۔

ان کے والد آغا سید علی عابد خود بھی صاحب قلم اور صاحب تصنیف تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اکبر جے پوری کا ادبی سفر تقسیم ملک سے پہلے شروع ہوا تھا لیکن کشمیر کے شعری اُفق پر وہ 1950ء میں نمودار ہوئے اور اس طرح کشمیر کے ادبی اور علمی حلقوں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا۔

ازل سے اکبر حزیں تجھے ملے ہیں غم ہی غم
تیرے لبوں پر کیوں ہنسی تلاش کر رہا ہوں میں

کہا جاتا ہے کہ اکبر جے پوری کے دوست بہت کم تھے اور چند ایک دوستوں نے انہیں دکھ بھی دیئے اور اس وجہ سے وہ بہت دیر تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے پر مجبور ہوئے تھے۔ خوددار اور عزت نفس کے مالک تھے ایک بے حد حساس قسم کے شاعر تھے ان کا یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے ؎

جن کو دیا ہے میں نے گلستان کا بانکپن
کانٹے وہ راہ گذر میں بچھا کر چلے گئے

اکبر جے پوری دراصل غزل کے شاعر تھے اور مرحوم نشاط انصاری اس تعلق سے لکھتے ہیں:

"اکبر جے پوری کا شمار اگر چہ ہماری وادی کے اُن روایتی غزل گو شعرا میں ہوتا ہے جو بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور نئی ادبی تحریکوں سے متاثر نہیں ہوتے تاہم آج کے کرب انگیز دور میں وہ ہیئتی شاعری سے کسی طرح بھی لاتعلق نہیں۔"

اکبر جے پوری اپنی ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصہ شہر کی ہنگامہ آرائیوں اور ہنگامہ خیز رنگینیوں سے دور دیہاتی ماحول میں رہے، اس دوران ان کی شاعری میں رومان کا عنصر شامل ہو گیا (شاید دل کسی کو دینے کے بعد)۔ دیکھئے کیا کہا ہے انہوں نے ؎

بھرپور جوش عشق میں اکبر تھا مرا دل
سمبل میں آ کے لٹ گیا ارمان نہ پوچھئے

(سمبل علاقہ حاجن میں واقعہ ہے)

ان کا ایک اور شعر عرض کرتا ہوں ؎

لباس سرخ میں نکھرا تری بہار کا رنگ
شفق کے سائے میں جیسے گلاب زار کا رنگ

اکبر جے پوری نہ صرف غزل کے شاعر تھے بلکہ ان کے نعتیہ کلام کی بھی کوئی کمی نہیں۔ انہوں نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے فارسی زباں میں بھی شعر گوئی کی ہے۔ ان کو فارسی پر پوری دسترس تھی۔ اکبر جے پوری نے کشمیر میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں ایک معلم اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مجاہد اُردو کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے کشمیر میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی۔ انہوں نے کشمیر میں حسینی مشاعرہ اور طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے صحافتی خدمات بھی انجام دیں۔

اکبر جے پوری کی ایک ہمشیرہ تھیں، شہزادی کلثوم۔ اُردو کی خاتون شاعرہ کی حیثیت سے انہوں نے ریاست میں کافی شہرت حاصل کی لیکن زندگی نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ بے وقت اس دنیا سے چلی گئیں۔ ان کا اُردو کلام اکبر جے پوری نے ترتیب دے کر 1963ء میں شائع کیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں اکبر جے پوری کی صحت بگڑ گئی، وہ بیمار رہنے لگے اور آخر 4/مارچ 1998ء کو ہمیشہ کے لئے یہ دنیا چھوڑ گئے۔ ان کی شائع شدہ شعری مجموعوں میں شمع فروزاں، پیغام حسین، شباب وطن، سازِ شکستہ، فکروفن اور فکرو خیال قابل ذکر ہیں۔

❁❁❁

51

ادب، ادیب اور معاشی تحفظ

شین مظفر پوری کا اصل نام محمد ولی الرحمٰن تھا اور شیدا تخلص اور یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ شعر و شاعری میں دلچسپی رکھتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے، افسانوی ادب میں شین مظفر پوری کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، وہ 1920ء میں مظفر پور میں پیدا ہوئے اور 14 راگست 1996ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اُنھوں نے باقاعدگی کے ساتھ 1937ء میں لکھنا شروع کیا حالانکہ اُن کی پہلی کہانی ''ایک یہودی لڑکی کی عصمت پرستی''، 1936ء میں شائع ہوئی تھی اور جب 1939ء کا زمانہ آیا تو اُن کا نام پوری اُردو دنیا میں مشہور ہو چکا تھا، وفات کے وقت اُن کی شائع شدہ کتابوں کی تعداد 21 تھی، اُن کی تفصیل یوں ہے:

افسانوی مجموعے: 9

ناول: 4

ناولٹ: 2

بچوں کے لئے کہانیاں اور ناولٹ: 2

ریڈیائی ڈرامے: 2

یاداشت: 1

طنز و مزاح: 1

انشائیے: 1

انھوں نے ایک اور ناول ''گرم راکھ'' بھی لکھا تھا جو اُن کی زندگی میں

شائع نہ ہوسکا۔ شین مظفر پوری نے یوں تو ناول اور ڈرامے بھی لکھے لیکن اُن کی اصل شناخت بطور افسانہ نگار ہی ہوئی شاید اُس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر اصناف کی بہ نسبت افسانہ اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا، اُن کے ادبی رجحانات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنا۔ اُن کے افسانے ملک کے مختلف جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے تھے......ایک انٹرویو کے دوران انہوں نے کہا تھا:

> ''میرے افسانے زندگی کے ٹھوس واقعات اور مسائل پر مبنی ہیں، میں بدنام بھی ہوں کہ میں جنسی اور فحش افسانے بھی لکھتا ہوں لیکن میں نے جنس کو موضوع کے طور پر اپنے کسی افسانے میں استعمال نہیں کیا ہے، میرے ان افسانوں میں اخلاقی زوال، گھریلو زندگی کی ناہمواریاں، جنسی مسائل، معاشی ناآسودگی اور سماجی نابرابری کے موضوعات نظر آتے ہیں۔''

شین مظفر پوری ایک افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھے وہ عصر جدید (کلکتہ) اور روزنامہ کارواں (کلکتہ) کے ایڈیٹر رہے ہیں، روزنامہ ہند سے بحیثیت نیوز ایڈیٹر اُن کا تعلق رہا ہے، بعض اخبارات میں بحیثیت مترجم بھی کام کیا، کالم نویسی بھی کی، فلمی اور نیم ادبی رسائل کے ایڈیٹر بھی رہے ان میں لائٹ اور آرٹسٹ قابل ذکر ہیں۔ 1960ء سے 1963ء تک ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ کو ایڈٹ کیا۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف لکھتے ہیں کہ شین مظفر پوری نہایت سادہ لوح، مخلص، خوددار اور گوشہ نشین انسان تھے اور اُن کی زندگی کا واحد مقصد تھا، اُردو ادب کی خدمت کرنا اور اس کی بقاء کے لئے کوشاں رہنا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے اُردو زبان وادب کے لئے خود کو وقف کردیا تھا۔

اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نرم گفتار، خوش اخلاق اور شریف انسان تھے، اُنہیں اپنے زمانے کے ایک کامیاب اور بلند پایہ افسانہ نگاروں کی

صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔..... ، قانون کی بستی ، دوسرا رُخ ، ماجرا جو گذر گیا ایک خواہش اور کیا جینا اور کیا مرنا نامی افسانے اُن کے تحریر کردہ افسانوں میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ماہنامہ بیسویں صدی ، روبی اور شمع کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے (ان رسائل میں ، میں نے ان کے بہت سارے افسانے پڑھے ہیں) لیکن ڈاکٹر احمد حسین آزاد کا کہنا ہے کہ ان رسائل میں مسلسل چھپتے رہنے کی وجہ سے شاید کسی نقاد نے سنجیدگی کے ساتھ اُن کے فن کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی حالانکہ ان رسائل میں شائع اُن کی کہانیاں خوبصورت اور فن کے بہتر نمونے ہیں۔

مشہور ناقد اور افسانہ نگار منظر عاشق ہرگانوی نے شین مظفر پوری کا ایک طویل انٹرویو لیا تھا!!!

سوال : کیا اُردو ادب اور مفلسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے؟

جواب : ادب مفلس نہیں ہے، ادب مالا مال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مفلسی اور ادب کے درمیان روحانی تعلقات ہیں، اچھا ادب ہمیشہ دردمند دل اور گھائل جذبات نے پیدا کیا ہے۔

''رقص بسمل''، شین مظفر پوری کی خودنوشت ہے لیکن یہ خودنوشت اُن کی جوانی کی روداد ہے، تقسیم ملک کے وقت انہوں نے کیا دیکھا کن حالات سے دوچار ہونا پڑا، وہ کیسے پاکستان جا پہنچے اور وہاں سے کیسے ہندوستان اپنی بیوی بچوں کے پاس لوٹ آئے ، ان سب باتوں کا اظہار انہوں نے کھلے انداز میں کیا ہے، اپنی زندگی میں وہ جس چیز سے بہت زیادہ متاثر ہوئے وہ ملک کا بٹوارہ تھا......!

اور بقول جمیل جالبی :

''شین مظفر پوری اپنے عہد سے پوری طرح واقف تھے اُن کی تخلیقات میں روایت ہے اور روایت کو توڑنے کا حوصلہ بھی، اِن کے افسانوں میں فکر کی چاشنی اور نئے شعور کی جاذبیت ہے۔''

1995-96ء میں احمد یوسف صاحب بہار اُردو اکادمی کے نائب صدر تھے اُن کا کہنا ہے کہ شین مظفر پوری ساری زندگی بدحالی کا شکار رہے۔ مظفر پوری صاحب خود اُن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''معاشی تحفظ کے بغیر ایک معذور اور بیمار ادیب کے بڑھاپے کی آبرو کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

اور آخر میں محمد ولی الرحمٰن یا شین مظفر پوری کا ایک شعر ؎

دامن حور سے کیوں بوئے شراب آتی ہے
زاہدوں نے کہیں جنت میں رچائی ہوگی

❀❀❀

52

کچھ یادیں کچھ آنسو

خلیل الرحمن اعظمی

پیدائش:9/اگست 1927ء سلطان پور اعظم گڑھ

وفات: یکم جون 1978ء اُردو باغ علی گڑھ،

مدفن:یونیورسٹی کے قبرستان میں منٹو اہی علی گڑھ میں اُن کی پیشن گوئی کے مطابق دفنائے گئے۔

اُن کے والد محترم مولانا محمد شفیع بڑے نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے، وہ ایک عالم دین تھے، مولانا کے پانچ فرزند تھے، خلیل صاحب سب سے چھوٹے مگر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب سے ممتاز تھے۔

تعلیم وتربیت: مضمون نویسی اسکول کی تعلیم کے زمانہ سے شروع کی۔ 1946ء میں جب اعظمی صاحب انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، انہوں نے اپنی پہلی نظم ''نفس ناتمام'' کے عنوان سے لکھی جو نیا دور بنگلور میں شائع ہوئی، یہ سہ ماہی رسالہ معروف ادیبہ ممتاز شیرین نکالتی تھیں۔ 1947 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ میں عارضی ملازمت مل گئی۔ اس برس ستمبر میں دہلی سے علی گڑھ آرہے تھے کہ فسادیوں نے زخمی کردیا، زخمی حالت میں جامع مسجد ریلیف کیمپ میں لائے گئے، تین ماہ وہاں پڑے رہے، 1951ء میں ایم اے کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرلی، اسی سال علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ساتھ ہی یونیورسٹی گزٹ میں ملازمت ملی، بعد میں شعبہ اُردو میں لیکچرر تعینات ہوئے۔

شادی: 1957ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی سال نومبر میں راشدہ بیگم سے شادی ہوئی، یہ شادی سہیل عظیم آبادی کے ذریعہ طے ہوئی تھی۔ بیگم کمال احمد صدیقی راشدہ بیگم کی بڑی بہن ہیں، اس شادی کی ساری تفصیلات سرینگر میں ہی طے پائی تھیں۔

تصانیف: خلیل الرحمٰن اعظمی نے بے شمار مضامین لکھے ہیں جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے، اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''کاغذی پیرہن'' کے نام سے شائع ہوا۔ 1936ء کے بعد کی تحریر کردہ نظموں کا مجموعہ ''نئی نظم کا سفر'' 1972ء میں شائع ہوا۔ ''نوائے ظفر'' ان کی ایک اور کتاب کا نام ہے۔ 1976ء میں ایک اور کتاب ''مضامین نو'' کے نام سے شائع ہوئی اُن کی آخری غزل ماہنامہ ''الفاظ'' (جولائی۔اگست 1978ء) میں شائع ہوئی۔

ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی اے زندگی رتبہ ہے اعلیٰ ترا

اُن کی آخری نظم کا عنوان تھا ...... ''نیند پیاری نیند'' یہ نظم اُنہوں نے مارچ 1977ء میں کشمیر جانے سے پہلے لکھی تھی، یہ نظم بھی ماہنامہ الفاظ میں شائع ہونے والی تھی لیکن بعد میں اعظمی صاحب کے کہنے پر اس نظم کی اشاعت روک دی گئی۔ اس نظم سے چند اشعار ؎

سوچتا ہوں
آج میرا یہ سفر کتنا طویل
فاصلے ...... اتنے کہ ان کی اب کوئی منزل نہیں
ایسی ایک منزل تو ساری عمر میں
طے کروں گا ورنہ تھک جاؤں گا میں
اور میری نیند روٹھی رہے گی

کیسے میں آرام کرلوں
کھول دیتا ہوں یہ آنکھیں
اور اب خوش ہوں کہ چلو فرصت ملی
اس مفت کی بے گار سے

کیا بتاؤں میرے اندر سے اسی دم
دوئی آنکھیں نکل کر
میری آنکھوں کی جگہ لیتی ہے
اور پھر پہنچ جاتا ہوں اُس کی دنیا میں
جس سے بھاگ کر آیا تھا میں......!!

فروری 1976ء میں جب کہ بیمار پڑے گئے تو اُنہیں جواہر لال میڈیکل کالج میں داخل کیا گیا...... وہ بلڈ کینسر کے مریض تھے اور پھر 29 رمئی 1978ء میں اُن پر اس بیماری کا شدید حملہ ہوا اور اُسی سال یکم جون کو وفات پا گئے ......اپنے چاہنے والوں کے لئے کچھ یادیں اور کچھ آنسو چھوڑ گئے......!!

۞۞۞

53

خط کا جواب

ہڈیوں بھرے پچکے ہوئے گال، لکیروں بھری پیشانی، چہرے کی نسبت سے کان بڑے بڑے۔ جی ہاں میں معروف ومقبول مزاح اور طنز نگار کنہیا لال کپور کی بات کرر ہا ہوں، کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک انگریز خاتون سے اُنہیں ملنے کا موقع ملا۔ اس خاتون نے کپور سے کہا..... ''آپ تو اتنے پتلے ہیں جتنی سوئی ہوتی ہے'' اس کے جواب میں کپور نے نہایت بھولے پن سے کہا:

''محترمہ آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں، چند ایک سوئیاں تو مجھ سے بھی موٹی ہوتی ہیں۔''

ایک بار مُوڈ میں آ کر انہوں نے تولنے والی مشین میں اکنی ڈال دی اور ثابت ہوا کہ جناب کا وزن پچاس سیر ہے اور اس کے بعد اِس قسم کا مُوڈ دوبارہ پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ تھی جناب کنہیا لال کپور کی ظاہری شکل وصورت کی ایک تصویر......!!

بقول فکر تونسوی، بہت سے قسم کے لوگوں میں کپور کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ عزت بھی ہر جنس کیلئے مختلف قسم کی شکل وصورت اختیار کر جاتی ہے۔ پروفیسر لوگ کپور کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ اس کا ایک ادبی مقام ہے بلکہ اس لئے کہ وہ پڑھانے کے ایک خاص ڈھنگ کا مالک ہے، کالج میں طالب علم اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک پاپولر ٹیچر ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے لکھے ہوئے خلاصے کام کی چیز ہوتے ہیں اور امتحان میں مدد کرتے ہیں۔

ادیب لوگ اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا ادیب

ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔ پبلشرز اس لئے اس کی عزت نہیں کرتے کہ وہ بہتر لکھتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی کتاب بکتی خوب ہے، محلے والے اس لئے اس کی عزت نہیں کرتے کہ وہ ایک پڑھا لکھا آدمی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ شریف پڑوسی ہے...... اور اب رہی بیوی تو وہ کپور کی عزت ایک خاوند کے نقطۂ نظر سے کرتی ہے جس کا اس دنیا میں سوائے بیوی کے کوئی نہیں......!!

آج ان باتوں کا جائزہ لینے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کنہیا لال کپور ایک......

۱۔ بہتر استاد تھا...... ایک پڑھا لکھا اُستاد

۲۔ بہتر قلمکار تھا...... طنز و مزاح کا شہنشاہ

۳۔ شریف پڑوسی تھا...... عزت و آبرو کا شیدائی

کنہیا لال کپور کی زندگی اور ان کے مرنے کے بعد بھی کوئی اس بات کی تردید نہیں کر سکا کہ مرزا اسداللہ خان غالب ان کی کمزوری تھی، بلکہ غالب سے انہیں عشق تھا، وہ غالب کی شعر و شاعری پر جان دیتے تھے، وہ اپنے طنز میں، اپنی گفتگو میں غالب کے شعروں کے حوالے کچھ اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے غالب کے شعروں کی سنجیدگی پر کپور کے طنزیہ حوالوں نے ڈاکہ ڈالا ہے۔

کنہیا لال کپور کا ایک مضمون ہے۔ عنوان ہے خط کا جواب...... وہ لکھتے ہیں کہ ایک بڑے آدمی میں ایک نہ ایک وصف ضرور ہوتا ہے اور مجھ میں یہ وصف ہے کہ میں کسی شریف آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا اور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی بڑا آدمی چھوٹے آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا۔ یقین نہ آئے تو کسی بڑے آدمی کو خط لکھ کر دیکھ لیجئے۔ 1952ء کا لکھا کپور جی کا یہ مضمون آج بھی جانے کتنے لوگوں کی ذہنوں میں محفوظ ہوگا، اُن کے ذہن کی تاروں کو ذرا ہلانے کے لئے یا زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے جن لوگوں نے خاص طور سے نئی نسل کے لوگ جنہوں نے یہ مضمون نہیں پڑھا ہوگا میں ان کے لئے ان خطوط سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

پہلا خط ہٹلر کے نام ہے......

برادرم ہٹلر...... القاب سے خفا نہ ہوں، برادرم اس لئے لکھا ہے کہ خاکسار بھی آپ کی طرح آرین ہے یہ آپ کیا کر رہے ہیں میرا مطلب ہے ہر رات لندن پر بمباری کیوں کی جارہی ہے، آخر انگریز بھی تو آرین ہیں، یہودی ہوتے تو چنداں مضائقہ نہیں تھا، اس لئے لندن پر مزید بمباری سے باز آجایئے اور اس خط کا جواب دیجئے۔

یہ دوسرا خط انہوں نے مشہور ہالی ووڈ ایکٹرس گری ارگاسن کو لکھا تھا......

ڈیری گری ارگاسن...... جب سے میں نے آپ کو فلم میں ہیرو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے دیکھا ہے دل چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات ہوجائے۔ لیکن افسوس کہ ہالی ووڈ دور ہے اور خاکسار کے پاس نہ ہوائی جہاز ہے اور نہ موٹر سائکل، صرف ایک صورت ہے اگر آپ ہوائی جہاز کا کرایہ اپنی پہلی فرصت میں بھجوادیں تو آپ سے ملاقات کے علاوہ امریکہ کی مفت سیر ہو جائے گی...... !!

ظاہر ہے کہ ان دونوں خطوط کا کوئی جواب نہیں آیا ہوگا۔ آخر بڑے آدمی جو ٹھہرے، اس کے ساتھ ہی میں کنہیا لال کپور کے نام آئے ہوئے خطوط سے بھی اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

مکرمی...... آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے تین سال قبل آپ نے شاید بجلی کا بل ادا کرنے کے لئے مجھ سے پانچ روپے قرض لئے تھے جو آپ نے آج تک ادا نہیں کئے کیا میں امید کروں کہ یہ رقم ادا کر کے ایک پرانے قرض سے سبکدوش ہونے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے...... !!

اور اب ایک اور خط سے:

محترمی ...... میں ایک گمنام ادیب ہوں، اس وقت تک ڈیڑھ سو کہانیاں لکھ چکا ہوں ان میں شائع ایک بھی نہ ہوئی۔ میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ چھپوانا چاہتا ہوں لیکن کوئی ناشر اسے چھاپنے پر تیار نہیں، اگر آپ دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارہ کریں تو شاید ناشر اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اسے چھاپ ہی دے۔ میں اتوار کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں، کھانا آپ کے ہاں ہی کھالوں گا......!!

اور ایک بڑے آدمی کے ناطے کپور نے کوئی جواب نہ دیا۔

اور بقول کنہیالال کپور:

''اچھے طنز کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے...... اچھا ہاضمہ، تیز وطرار طبیعت اور دماغی توازن، اگر ان تینوں میں سے کسی چیز کی کمی واقع ہو جائے تو طنز، طنز نہیں رہتا۔ دشنام یا ہجو بن جاتا ہے......!!

✿✿✿

تھانیدار کی کہانی......اپنی زبانی

تھانیدار نامی کتاب کے مصنف لالہ امر ناتھ ملہوترہ کو 19 ر مئی 1956 ء یعنی اب سے کوئی پچاس سال قبل پارلیمنٹ کے ہندی ایسوسیشن کی جانب سے پنڈت جواہر لعل نہرو نے پانچ سو روپے کے نقد انعام سے نوازا تھا لالہ امر ناتھ کا تعلق جموں شہر سے تھا۔ وہ پولیس میں بحیثیت تھانیدار تعینات ہوئے تھے بعد میں سپر نٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے سبکدوش ہوگئے۔ ان کو اب اس دنیا سے گئے کافی عرصہ گذر چکا ہے لیکن کہتے ہیں کہ تحریروں میں پوشیدہ نام کبھی نہیں مرتا ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب 1955 ء میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت چھ روپے اور کتابت اشھد علی نے کی ہے۔ لالہ جی نے انتساب یوں کیا ہے ......

"اُن فرض شناس پولیس افسروں کے نام جو کسی ستائش
رسوخ یا سفارش سے مرعوب نہ ہوئے اور جنھیں کوئی ترغیب راہ مستقیم
سے ہٹا نہ سکی۔

اس کتاب کا پیش لفظ سندر شیام پرویز نے لکھا ہے۔ اس پیش لفظ کے ابتداء میں انہوں نے پولیس سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے لیکن جب لالہ امر ناتھ ملہوترہ جیسے پولیس آفیسروں سے اُن کا واسطہ پڑتا ہے تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ پولیس میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو قابل احترام ہیں۔ جن کی گفتگو میں شیرینی ہے، حلاوت ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ لالہ جی نے کسی تفتیش کے دوران ملزم

پر سختی کر کے اقبال جرم نہیں کرایا ہے، وہ اپنے ملزم سے اس طرح پیش آتے کہ وہ انہیں اپنا مہربان اور مشفق سمجھنے لگتا۔ سندر شیام پرویز اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ کریکٹر کی بلندی ہی انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اگر کوئی پولیس افسر اس خوبی سے محروم رہے تو یہ اُس کی اور اُس کے محکمے کی بدنصیبی ہے کیونکہ خدمت عامہ کے جس جذبے کے تحت اس محکمہ کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ بنیاد اُس وقت تک مضبوط نہ ہوگی جب تک کہ اس محکمہ کے ملازمین اعلیٰ کردار کے مالک نہ ہوں۔

لالہ امرناتھ ملہوترہ نے اس کتاب میں جن مقدمات، تفتیشوں اور کیسوں کی نشاندہی کی ہے اُن کی تعداد بیالیس ہے، اور ان سب کی تحقیقات خود ملہوترہ جی نے انجام دی ہیں۔ انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ ایک ایک کیس کے بارے میں روشنی ڈالی ہے اور ان واقعات کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ کوئی جاسوسی کہانی پڑھ رہے ہیں لیکن جب اختتام سامنے آتا ہے تو خود بخود محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی جاسوسی کہانی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔

ایک پولیس آفیسر کن خوبیوں کی وجہ سے عزت و آبرو کا مقام حاصل کر لیتا ہے لالہ جی نے ان خوبیوں کی بھی وضاحت کی ہے، وہ کہتے ہیں:

۱) قوت عمل کی بیداری تفتیش کرنے والے کی آنکھوں میں سرمہ سلیمان کا کام دیتی ہے۔

۲) دنیا کے نظم و تربیت کے حامیوں کی نگاہوں میں علم لطف دوسرے تمام فنون پر فوقیت رکھتا ہے۔

۳) تنظیم پولیس کا کام اگر چہ قیام امن بھی ہے لیکن سراغ رسانی اس کے کردار کی جان ہے۔ پولیس ملازمین کو اُن ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے جو عوام کا محافظ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد ہوتی ہیں۔

۴) اس میں شبہ نہیں کہ سائنس سنگین جرائم کا سراغ لگانے میں بہت مدد کررہی ہے، آئندہ بھی سائنس سے بہت مدد ملے گی لیکن پولیس والے جب تک ذاتی صلاحیتوں کو اُبھرنے نہیں دیں گے اُن کا تفتیش میں کامیاب ہونا محال ہے۔

۵) کوئی فن اُس وقت تک مناسب ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے متعلق کافی لٹریچر موجود نہ ہو، ذہنی مشاہدات اور تجربات کے لئے پڑھنا لکھنا نہایت اہم ہے۔

تھانیدار میں لالہ امرناتھ ملہوترہ نے ایک وردی پوش کے لئے جن بنیادی اصولوں اور خوبیوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہ ہیں......!

۱) دیانت داری اور فرض شناسی
۲) نیک چلنی اور عوام کی خدمت کا احساس
۳) جفاکشی اور خوش خلقی
۴) ضبط نفس اور راست روی
۵) ہمدردی اور رعب
۶) قوت ارادی یا ذاتی بھروسہ اور
۷) ابتدائی رپورٹ کی صحیح اور مکمل اندراج......!!

آج کے دور میں پولیس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہورہا ہے پولیس کی ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں، اب تو جرائم کی نوعیت ہی بدل گئی ہے۔ عصمت دری اور آبرو ریزی کے نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، زندہ انسانوں کی گمشدگی کے واقعات رونما ہورہے ہیں، بے نام قبروں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے، اس لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتاری کے پسِ منظر میں ہماری پولیس کو ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے لیکن اس کے باوجود بنیادی باتیں وہی ہیں جن کا ذکر لالہ امرناتھ ملہوترہ نے کوئی پچاس سال پہلے اپنی کتاب تھانیدار میں کیا ہے..........!!!

۞۞۞

55

گفتگو بند نہ ہو

میں جن نعمت اللہ صاحب کی بات کر رہا ہوں وہ ادبی اور صحافتی دنیا میں حاجی انیس دہلوی کے نام سے جانے جاتے ہیں، نعمت اللہ 7 ستمبر 1930ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور حاجی انیس دہلوی کا جانا پہچانا نام اپنا کر 30 دسمبر 2000ء دہلی میں ہی وفات پا گئے!

انیس دہلوی کو کمزور معاشی حالت کے پیش نظر بہت کم عمری میں عملی زندگی میں حصہ لینا پڑا لیکن اپنی محنت، ایمانداری، خلوص، ذہانت اور مسلسل متحرک رہنے کے سبب نہ صرف خوشحال دن دیکھے بلکہ عزت اور شہرت بھی حاصل کی، وفات کے وقت رہبر کارنر (پبلشنگ ہاؤس) رہبر آفسٹ پریس، رہبر یونانی دواخانہ کے علاوہ دو ماہنامے فلمی ستارے اور باجی اور ایک سہ ماہی ادبی جریدہ ''ایوانِ ادب'' اپنے بچوں کے لئے چھوڑ گئے۔ ایوان ادب کی اشاعت بند ہو چکی ہے، باجی اور فلمی ستارے شائع ہو رہے ہیں اگر چہ فلمی ستارے کی اشاعت میں بے قاعدگی آ گئی ہے، دراصل ماہنامہ ''شمع'' کی اشاعت بند ہونے کی وجہ سے فلمی ستارے کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا تھا، مرحوم انیس دہلوی نے فلمی ستارے کو شمع کے معیار پر لانے کے لئے بہت محنت کی۔ ادبی تخلیقات کی جانب توجہ دی، فلمی ستارے کو نئی آن بان اور شان سے شمع بنا کر میدان میں ڈٹ گئے۔ ایک ملاقات کے دوران خود حاجی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ فلمی ستارے کو شمع جیسا رنگ و روپ دینے کیلئے کافی محنت کی ضرورت ہے، انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کر لیا تھا کہ شمع کی اشاعت بند ہونے سے فلمی ستارے کی مانگ بڑھ رہی ہے اور بقول اُن

کے صرف شہر حیدر آباد میں پانچ سو کاپیوں کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی مانگ بڑھ گئی ہوگی۔

انیس دہلوی کا بچپن سے ہی صحافت کی جانب رجحان تھا، اُنہوں نے 1946ء میں صرف سولہ برس کی عمر میں مختلف اخباروں کیلئے لکھنا شروع کیا۔ 1950ء میں ایک دیواری روزنامہ (وال پیپر) نکالنا شروع کیا۔ 1960ء میں ہفت روزہ ہمارا رہبر جاری کیا۔ 1966ء میں ماہنامہ ''نرالی دنیا'' کی اشاعت شروع کی۔ اس کے علاوہ ماہنامہ سازش، عمران دی گریٹ، جاسوسی فتنہ، عمران سیریز، فریدی سیریز اور ہندی میں سچی کہانیاں جیسے پرچے نکالے۔ 1972ء میں فلمی ستارے کی اشاعت شروع کی۔ 1990ء میں خواتین کے لئے ''باجی'' کا آغاز کیا۔

مرحوم حاجی انیس دہلوی کو اُن کی زندگی میں بے شمار اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا، ان انعامات کی تعداد بیس سے زائد ہے۔

وہ شاعر بھی تھے اور اُن کا مجموعہ کلام ''قدم بہ قدم'' 1997ء میں شائع ہوا۔ حمد و نعت کا ایک اور مجموعہ ''دست دعا'' کے نام سے اُن کے فرزند ناصر دہلوی شائع کرنے والے تھے، یہ مجموعہ شاید ابھی تک شائع نہ ہو سکا ہے۔

ستر برس کی دھوپ گئی سر سے اے انیس
کچھ تحریروں کو نور نے اُجلا بنا دیا

حاجی صاحب صوم وصلوات کے بے حد پابند تھے۔ چار بار حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔

آزمائش سے گذرنے کی نہیں ہے لت
معجزوں کیلئے ہر شخص عصا مانگے ہے

حاجی صاحب شدید علالت کی وجہ سے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں سماعت سے محروم ہو گئے تھے لیکن ان میں بھلا کی ذہانت تھی، وہ ہونٹوں کی جنبش

سے جملے پہچان لیتے تھے وہ تو کاغذ اور قلم ساتھ ہی رکھتے تھے۔ میں جب اُنہیں اُن کے ہی دفتر میں آخری بار ملا تو حاجی صاحب ''ایوانِ ادب'' کا پہلا شمارہ شائع کر چکے تھے اور دوسرا شمارہ زیرِ ترتیب تھا، میں نے اس شمارہ کے لئے جو کہانی بھجوائی تھی وہ اُنہیں بے حد پسند آئی تھی، اس کا اظہار انہوں نے باتوں باتوں میں کیا تھا، اس ملاقات میں اُنہوں نے بہت سی ادبی باتیں چھیڑیں اور مجھے اُن کی ہر بات کا جواب لکھ کر دینا پڑا۔ اس دوران اُن کے دو بیٹے کفایت دہلوی اور ناصر دہلوی بھی تشریف فرما تھے لیکن وہ خاموش رہے اور اپنے کام میں مصروف۔ حاجی صاحب کی وفات کے بعد بھی مجھے دو ایک بار فلمی ستارے کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا لیکن اُن کی ''تختِ صحافت'' خالی تھی، اُن کی زندگی میں بھی اُن کے بیٹے کفایت، ناصر اور سمیع کرسیوں پر بیٹھے تھے اور خود وہ ایک تخت پر۔

چہرے کا تاثر تو زمانے کے لئے ہے
پڑھئے میری آنکھوں میں جو پیغام لکھے ہیں

فریدہ خان کے ایک سوال کہ نئی نسل کے لکھنے والوں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے، کے جواب میں مرحوم حاجی انیس دہلوی نے کہا تھا:

> ''وطن عزیز میں نئی پیڑھی پر مشتمل قلمکار برادری انتہائی باشعور ہے، علم وادب پر اُن کی گرفت مضبوط ہے، معتقدین کا احترام اور متاخرین کی تقلید ان کی نگارشات کو جلا بخشنے کیلئے کافی ہیں، کتب بینی، اخبار بینی، علمی معیار کے جریدوں کی ورق گردانی کرتے رہنا اور چربہ سازی سے اجتناب ارتقا کی بنیاد ہیں، بچوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے۔''

اختر شاہجہاں پوری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ انیس دہلوی کا کلام کا بغور جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتے تھے، سماجی بدحالی، اعلیٰ قدروں کا زوال انہیں ہمیشہ بے چین رکھتا تھا

اور وہ اسے شعری پیکر میں ڈھالنے میں بے چین ہو جاتے ہیں۔

اُسے بھروسہ نہیں میری رہنمائی پر
مراقبیلہ حریفوں کے ساتھ چلتا ہے

موت دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے اور اس سچائی سے انکار ممکن نہیں، حاجی انیس دہلوی صاحب چلے گئے اس فانی دنیا سے لیکن اپنے پیچھے اپنے چاہنے والوں کیلئے ایک ایسا ادبی سرمایہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتا رہے گا۔

میرے پرکھوں کی بھی مٹی ہے اِسی مٹی میں
اس لئے خاکِ وطن مجھ کو بھلی لگتی ہے

❁❁❁

56

محبتوں کا سوداگر۔ راہی معصوم رضا

ریاست جموں و کشمیر کی آب و ہوا اور موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ یہاں ادبی سرگرمیاں کبھی عروج پر نظر آتی ہیں اور کبھی مایوس کن حد تک ماند پڑ جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں ریاست بھر میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا، مشاعرے تو اب بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا دائرہ اب ریڈیو اور ٹی وی تک سمٹ کر رہ گیا ہے۔ میں جن مشاعروں کی بات کر رہا ہوں ان میں سامعین کی ایک اچھی خاصی تعداد شمولیت کرتی تھی، ان مشاعروں میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونِ ریاست کے اکثر نامور اور معروف شعراء بھی شریک ہوتے تھے، مشاعروں کی کاروائی پورے نظم و ضبط کے ساتھ انجام دی جاتی تھی، لوگ زبان بند کر کے کاروائی میں حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ وہ ہر اچھے شعر پر داد دیتے اور ہر غیر معیاری شعر پر اپنی ناپسندیدگی کا کھلم کھلا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں رہتے تھے...... ان مشاعروں کے پسِ منظر میں میری نظروں کے سامنے ایک چہرہ اُبھر رہا ہے۔ یہ چہرہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا کا ہے۔ وہ بھی اکثر ان مشاعروں میں حصہ لیتے تھے، اُن کے اندازِ بیان میں ایک دلکشی تھی، وہ اپنا ہر شعر اکثر ترنم سے پڑھتے تھے۔ راہی صاحب نے اپنی زندگی کا بہت حصہ کشمیر میں گذارا، کشمیر میں ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ جہاں تک میری یاداشت کا تعلق ہے۔ شمیم احمد شمیمؔ، کشوری کول (آرٹسٹ) غلام رسول کوچک اور ڈاکٹر مرزا اُن کے قریبی دوستوں میں سے تھے، راہی کشمیر میں ہو رہی ادبی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیتے تھے، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، کشمیر سے جانے کے بعد وہ ممبئی جا بسے اور وہاں انہوں نے

کئی مقبول فلموں کے لئے کہانیاں لکھیں، مکالمے لکھے، وہ بی آر چوپڑہ پروڈکشن سے وابستہ تھے۔ جس زمانے میں ابن صفی کا جاسوسی دنیا بے حد مقبول تھا، اُسی زمانے میں جاسوسی دنیا شائع کرنے والا اشاعتی گھر رومانی دنیا کے عنوان سے ایک اور ماہنامہ شائع کرتا تھا۔ یہ رومانی کہانیاں راہی معصوم رضا ایک فرضی نام سے لکھتے تھے۔

مجھ کو ڈھونڈنے والو ڈھونڈو خود میری تحریروں میں

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا ہے جو دو ماہی ''محور'' میں 1963ء میں شائع ہوا تھا۔ لکھتے ہیں:

''میری نسل کا المیہ یہ ہے کہ ہم جس دنیا میں پیدا ہوئے تھے وہ مر چکی ہے بلکہ اسے خود ہم نے مارا ہے لیکن قبل اس کے کہ ہماری شخصیتیں پختہ ہو جاتیں ایک اور دنیا پیدا ہو گئی اور ہم اس پیدا ہونے والی دنیا کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ ہماری شخصیتوں کا ایک حصہ اس مر جانے والی دنیا کے ملبہ میں دبا ہوا ہے، میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں۔''

بقول راہی جب وہ چوتھے درجے کا طالب علم تھا تو ہڈیوں کے تپ دق میں مبتلا ہوا، بہت دنوں تک درد چھپائے گھومتا پھرتا رہا، ایک روز گر پڑا لیکن جس دن اُٹھا تو اُٹھنے میں پانچ سال لگ گئے، وہ پانچ سال ان کے لئے یک رنگ تھے لیکن ان پانچ سالوں میں ادب ایک چور دروازے سے اُن کی زندگی میں داخل ہوا۔

کھڑکیوں کی آنکھوں سے
آسمان کو دیکھتا ہوں
آج اپنے کمرے میں
کس قدر اکیلا ہوں......!!

شاعری کے بارے میں ان کے خیالات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں

لکھتے ہیں:

''لفظوں سے شاعری کی دوستی ہونی چاہیے ورنہ جس طرح ہم کسی اور اجنبی کے دل کی بات نہیں کہہ سکتے اس طرح اجنبی الفاظ سے بھی ہم کھل کر باتیں نہیں کر سکتے چنانچہ اظہارِ تمنا ناقص ہو جاتا ہے، یہ اجنبی الفاظ ہم سے پرہیز کرتے ہیں، اس لئے میں ان الفاظ کے استعمال کے خلاف ہوں جن سے شاعر کی بے تکلفی نہ ہو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہی الفاظ استعمال کروں جو میری زبان پر چڑھے ہوتے ہیں جنہیں مجھے یاد نہیں کرنا پڑتا ہے جو بغیر دستک دیئے ذہن میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

اور جب وہ اپنے زمانے کے دوسرے قلم کاروں کی بات چھیڑتے ہیں تو اُنکے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''یہ خیال غلط ہے کہ ہمارے شاعروں اور افسانہ نگاروں کو فلم کی ناگن نے ڈس لیا، فلم تو ارسطو کا ڈرامہ ہے، اظہارِ خیال کا اعلیٰ وسیلہ ہے، ہمارے ادیبوں کو اُن کی بلند آہنگی نے کھالیا..... تابان (غلام ربانی) اب صرف غزلیں لکھتے ہیں، وامق جونپوری نے شعر گوئی سے توبہ کرلی ہے، کیفی خاموش ہیں، سردار جعفری دوسروں کے دواوین مرتب کررہے ہیں۔ عصمت کی زبان میں لکنت ہے اور کرشن چندر بہت خراب اور بہت زیادہ لکھ رہے ہیں، ایک مخدوم محی الدین کے بغیر کوئی تخلیقی کام نہیں کر رہا ہے۔ مخدوم نے اپنی آواز کم کرلی ہے باقی تمام لوگ بلند آہنگی کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ اب ان کے لئے اپنی آواز کم کرلینا دشوار ہوگیا ہے۔''

ایک بار ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا تھا:

''علامتوں، استعاروں اور تلمیحوں کے بغیر شاعری ناممکن ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں نئی تلمیحوں اور علامتوں کی ضرورت ہے۔ میں ہندو دیومالا کے خزانے کھنگال رہا ہوں، کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہ سب کچھ ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، اول تو ہندوؤں کو خوش کرنا کوئی بری بات نہیں۔ دراصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندو دیومالا پر میرا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مہادیوی یا پنت کا، میں گنگا کے کنارے کھیل کر جوان ہوا ہوں، میں نہیں مانتا کہ گنگا صرف ہندوؤں کے لئے ہے یا پیپل کے گھنے سائے پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ میں اس ورثہ کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اس شیو سے کوئی دلچسپی نہیں جو تخریب کا دیوتا ہے لیکن میں اس شیو پر جان دیتا ہوں جو نٹ راج ہے۔ مجھے اس کرشن سے کوئی دلچسپی نہیں جس سے گیتا منسوب ہے لیکن میں اس نٹ کھٹ ماکھن چور نیل منی پر عاشق ہوں جس کی ہنسی کی آواز پر کائنات جھوم جاتی ہے، رادھا اور میرا پر میرا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اٹل بہاری واجپائی کو......!!''

ڈاکٹر معصوم رضا یکم اگست 1927ء کو گنگولی (غازی آباد) میں پیدا ہوئے اور 15 / مارچ 1992ء کو ممبئی میں انتقال کر گئے۔ اُن کے کئی شعری اور نثری مجموعے (اُردو اور ہندی) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا آخری ناول ''اسنتوش کے دن'' 1986ء میں شائع ہوا تھا۔ اُن کا یہ ناول 1984ء کے ممبئی فسادات کے پسِ منظر میں بے حد اہم تسلیم کیا جاتا ہے......!!

57

میری زندگی کا پہلا موڑ

خواجہ احمد عباس کے نام سے کون واقف نہیں، اُن کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ تھیں، وہ ایک بلند قامت صحافی تھے، عظیم کہانی کار اور ناول نگار تھے، اُنہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا، وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے، فلم اور فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے، اُنہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں، مکالمے لکھے اور کئی فلموں کی ہدایت بھی دی اور آج کے سپر سٹار امیتابھ بچن کو اپنی فلم ''سات ہندوستانی'' میں پہلی بار پیش کیا۔ چھ افسانوی مجموعوں کے علاوہ انہوں نے ''اندھیرا اُجالا'' کے نام سے ایک ڈرامے کو کتابی صورت دی، اُن پر بے شمار مضامین لکھے گئے اور آج بھی لکھے جارہے ہیں۔ ''چار دل چار راہیں'' نہ صرف اُن کا ایک ناول ہے بلکہ ایک فلم بھی، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں جس چوراہے کی کہانی لکھ رہا ہوں، یوں سمجھئے وہ ہندوستان کے تقریباً وسط میں کسی جگہ ہے لیکن آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ چوراہا نہ صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے بلکہ پاکستان اور پاکستان کی طرح دنیا کے بیشتر ملکوں میں بھی.....!!''

چار دل چار راہیں کی تاریخ اشاعت ستمبر 1959ء ہے۔ یہ ناول انہوں نے مینا کماری کے نام منسوب کیا ہے۔ اُن کا مشہور افسانوی مجموعہ ''زعفران کے پھول''، پہلی بار 1948ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر اس کے کئی اور ایڈیشن شائع ہوئے، اس افسانوی مجموعے میں صرف تین کہانیاں ہیں۔ زعفران کے پھول کشمیر کے پسِ منظر میں لکھی گئی ہے اس میں شیخ محمد عبداللہ صاحب کا ذکر بھی ہے زعفران کے پھول کی تین طویل کہانیوں میں خواجہ صاحب کا فن اپنے پورے شباب پر نظر آتا ہے، ان کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ عباس صاحب فکر و بصیرت

سرچشمہ تھے، انسان کی عظمت اور نئے جہاں کی تشکیل کے لئے کام کرنا اُن کا بنیادی مقصد رہا ہے، وہ فن میں حسن کے قائل تھے، وہ اُس آزادی کے خواہاں تھے جہاں غربت اور افلاس نہ ہو، فاقہ اور فاقہ مستی نہ ہو۔

میں دراصل بات کرنا چاہتا ہوں خواجہ احمد عباس کے ایک مضمون کے تعلق سے اس مضمون کا عنوان ہے ''میری زندگی کا پہلا موڑ'' اور یہ مضمون ماہنامہ سیپ (کراچی) کے خاص نمبر میں شائع ہوا ہے۔ (اگست 1968ء) بہت سارے پڑھنے والوں اور خاص طور سے نئی نسل کو یہ مضمون پڑھنے کا شاید ہی موقع ملا ہو۔ میں اس مضمون سے صرف چند اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں:

''میری زندگی کا پہلا موڑ سچ مچ سڑک کا ایک موڑ ہی تھا۔

جلیانوالہ باغ والے قتل عام سے اگلے برس کی بات ہے شاید میری عمر اُس وقت پانچ برس کی ہوگی مگر واقعہ کا نقش اب تک میرے دماغ میں موجود ہے۔ میں اب بھی اس منظر کو اپنے تخیل میں دیکھ سکتا ہوں۔ ہمارے قصبہ میں چھ سات سکول تھے دو ہائی سکول اور باقی پرائمری سکول، ہر سکول میں دو سو لڑکے پڑھتے تھے، یہ سب ہزار بارہ سو لڑکے پانچ سے سولہ برس کی عمر کے اس وقت سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے، اس سڑک کو ہم سڑک اعظم کہتے تھے، اَن پڑھ لوگ جرنیلی سڑک کہتے تھے جو تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے وہ گرینڈ ٹرنک روڈ کہتے تھے سنا تھا کہ یہ سڑک پشاور سے لیکر کلکتہ تک جاتی ہے۔

......☆☆☆......

اس وقت دن کے بارہ بجے تھے گرمی کے دن تھے، ہم کھڑے تھے ہماری ٹانگیں تھک گئیں تھیں، میں کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا، کبھی دوسری پر کبھی شمال کی طرف نظر کرتا تھا۔ جدھر سے سنا تھا انگریز گھوڑ سوار فوج آنے والی ہے مگر یہ سڑک تھوڑی دور آگے جا کر مڑ گئی تھی۔ اس نظر میں ایک انجانا خوف تھا اور لڑکپن کا تجسس بھی تھا اور موڑ کے ادھر کیا ہے اُس کی ایک عجیب کشش بھی تھی، اس سڑک کے موڑ کی اہمیت کا احساس ہمیں بہت بعد ہوا لیکن ہم سے کتنوں کے لئے وہ زندگی کا پہلا موڑ تھا۔

......☆☆☆......

آخر کا جس گھڑی کا انتظار تھا وہ آ ہی گئی ، پہلے تو نظر کچھ نہیں آیا ، ایک آواز سنائی دی جیسے دور کہیں بادل گرج رہے ہوں پھر آواز صاف ہوتی گئی ۔ ہزاروں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کے ساتھ ساتھ لوہے کی رکابوں ، بوٹوں ، زنجیروں ، بندوقوں اور نیزوں کے آپس کے ٹکرانے کی آواز بھی تھی ، پھر آواز قریب آ گئی ۔ اب ہم کسی قدر سہمے ہوئے تھے اس موڑ کی طرف دیکھ رہے تھے پہلے دھول اُڑی پھر اُسی دھول کے بادل میں ایک انگریز گھوڑے پر سوار نظر آیا ، اس کے پیچھے پورا رسالہ تھا ، پہلے انگریز افسر تھے پھر انگریز سپاہی تھے ، ہر ایک خاکی وردی پہنے ہوئے ، پیٹیوں میں پستول لگائے ہوئے ، گھوڑے کی زین میں اُلٹی رائفل رکھے ہوئے ، اِن کے پیچھے توپوں کی گاڑیاں تھیں جن کو خچر کھینچ رہے تھے ، پھر ہندوستانی فوج یہ بھی گھوڑ سوار تھے ، کلف لگے خاکی صافے ، اونچے ٹُرے ، پنجابی ، بلوچ ، سکھ ، جاٹ پھر انگریزی سپاہی جیسے ہندوستانی سپاہیوں کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوں......!!

......☆☆☆......

یہ برٹش سامراج کی فوجی طاقت کا مظاہرہ تھا ، توپیں ، بندوقیں ، رائفلیں ، مشین گنیں ، تلواریں ، سنگینیں ، پستول ، ریوالور ، لال منہ والے انگیز افسر اور سپاہی ، کالے اور سانولے ہندوستانی فوج ، اس پریڈ کا یہی مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراجی فوج کی دہشت بٹھادی جائے ۔

☆☆☆

ان پریڈوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہندوستانی بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر دہشت پسند انقلابی بن گیا ۔ ان بچوں کے دلوں میں انقلابی سیاسی خیالات پلتے رہے ، پکتے رہے ، اِن ہی میں سے ایک میں بھی تھا اور وہ موڑ جس کے پیچھے سے انگریزی فوج نمودار ہوئی تھی وہ میری زندگی کا پہلا موڑ تھا جس نے میرے شعور میں انقلاب پیدا کر دیا......!!

✿✿✿

58

چھوڑ جائیں گے یہ دُنیا تنہا

چند روز قبل راجوری سے ایک صاحب ''کہاں گئے یہ لوگ'' کے تعلق سے فون سے بات کررہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں مینا کماری کے بارے میں بھی لکھوں۔ ریسیورر کھنے کے فوراً بعد میری نظروں کے سامنے مینا کماری کا سراپا گھوم پھر گیا اور ایک بہت پرانی بات میرے ذہن کے پوشیدہ گوشے سے ابھر آئی، بہت زمانہ گذرا ریذیڈنسی روڈ پر شکتی سویٹ ہاؤس کے قریب مرحوم نور محمد کی شراب کی دکان ہوا کرتی تھی۔ وہ بے حد شریف اور با اخلاق انسان تھے، ہمیشہ مسکراتے نظر آتے لیکن اُس زمانے میں زندگی کی تلخیاں فروخت کرتے تھے، یہ دکان اب بھی موجود ہے لیکن اب یہاں تلخیاں نہیں مٹھاس بکتی ہے۔ جی ہاں! اب یہ مٹھائیوں کی دکان میں تبدیل ہوچکی ہے۔ ایک شام اسی دوکان پر میں نے مینا کماری کو شراب کے نشے میں دُھت دیکھا۔ کہتے ہیں جب مینا کماری بستر مرگ پر تھی تو اس نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی بہن سے کہا ''آپا شراب کی صراحی بننے کی بجائے میرا یہ پیٹ کسی بچے کی پیدائش کا ذریعہ بھی تو بن سکتا تھا۔''

یہ تو بات سے بات نکل آئی۔ فلم اداکارہ مینا کماری کا اصلی نام مہ جبین تھا۔ وہ یکم اگست 1932ء کو پیدا ہوئی۔ والد کا نام علی بخش تھا، وہ ایک پارسی تھیٹر کمپنی سے وابستہ تھے، والدہ ایک رقاصہ تھیں۔ مالی لحاظ سے وہ غریب تھے اور غربت کی وجہ سے وہ اپنے والدین کی لاڈلی نہ بن سکی لیکن وہ صرف چھ برس کی تھی کہ اپنے والدین کے لئے کمائی کا ذریعہ بن گئی، شاید یہی وجہ تھی کہ مرتے وقت تک مہ جبین یا

مینا کماری کو اپنی تنہائی کا شدید احساس رہا اور تنہائی کے احساس نے اسے وہ درد دیئے، وہ دُکھ دیئے کہ شراب کا نشہ بھی اس احساس کو کم نہ کرسکا۔

ہدایت کار وجے بھٹ نے 1936ء میں مینا کماری کو ایک چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنی فلم لیدر مینس میں کام کرنے کا موقع دیا اور بعد میں 1952ء میں فلم ''بیجو باورا'' میں ہیروئن کے روپ میں پیش کیا اور جب 1953ء میں اپنی پہلی فلم پر بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا تو اس کی فلمی زندگی کا ایک اہم اور نیا دور شروع ہوا۔ اور پھر ایک سال بعد فلم ''پرنیتا'' کے لئے مینا کماری کو ایک بار پھر فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اور اس طرح فلم انڈسٹری کی کتاب میں ایک نیا باب شامل ہوگیا۔ فلم آزاد اور فلم کوہِ نور میں مینا کماری نے اپنے کردار کے ذریعہ ہنسنے ہنسانے کا کردار ادا کیا۔ یہ دونوں فلمیں کامیاب بھی رہیں لیکن مینا کماری نے دراصل المیہ کردار نبھانے کے لئے فلمی دنیا کو اپنا لیا تھا۔ مینا کماری کی المیہ اداکاری کا نقطۂ عروج صاحب بی بی اور غلام کو سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح 1957ء میں بننے والی فلم شاردا ان کی ایک لاجواب فلم تھی۔ ممبئی جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے مینا کماری کو اس فلم کے لئے بہترین اداکارہ کے اعزاز سے نوازا۔

پھر ان کی زندگی میں کمال امروہی آگئے۔ لیکن کمال صاحب کے کمال دیکھ کر مینا کماری نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن انہیں اپنے دل سے نکال نہ سکی۔ شاید اسی وجہ سے ان سے دور ہونے کے باوجود بھی فلم پاکیزہ میں کام کرتی رہیں جس کا آغاز 1956ء میں ہوا تھا اور جس کے بننے میں 16 سال لگ گئے۔ مینا کماری کی عظمت کا ایک اور رنگ دیکھئے جب کمال امروہی کو اپنی فلم پاکیزہ کے لئے سرمایہ کی ضرورت پڑی تو مینا کماری نے اپنی زندگی کی ساری کمائی 40 لاکھ روپے ان کو دیئے۔

مینا کماری افسانہ تو نہ لکھتی تھی لیکن بقول راجندر کمار (فلم ایکٹر) مینا کماری کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی جب وہ کسی کی طرف دیکھتی تھی تو اپنی

آنکھوں سے افسانے کہتی تھی، شاید ان آنکھوں نے مایوسی دیکھی تھی، تنہائی دیکھی تھی ۔ وہ تو فلم پاکیزہ بھی نہ دیکھ سکی۔ فلم پاکیزہ جب 4 فروری 1972ء کو ریلز ہوئی تو اسے ایک فلاپ فلم قرار دیا گیا لیکن جب 31 / مارچ 1972ء کو مینا کماری کی موت کی خبر منظر عام پر آئی تو لوگ پاکیزہ دیکھنے کے لئے جوق در جوق سینما ہالوں میں جانے لگے اور اس طرح پاکیزہ ایک سپرہٹ فلم میں تبدیل ہوگئی۔

مینا کماری ایک شاعرہ بھی تھیں۔ ناز ان کا تخلص تھا۔ مینا کماری ناز!!

ان کی ایک نظم پیش کرر ہا ہوں ۔

چاند تنہا ہے آسماں تنہا
دل ملا ہے کہاں کہاں تنہا
بجھ گئی آس چھپ گیا تارا
تھرتھراتا رہا دھواں تنہا
زندگی کیا اسی کو کہتے ہیں
جسم تنہا ہے اور جاں تنہا
ہمسفر کوئی گر ملے بھی کہیں
دونوں جلتے رہے تنہا تنہا
جلتی بجھتی سی روشنی کے پرے
سمٹا سمٹا سا اک مکاں تنہا
راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

✿✿✿

59

آخری اسکور

آفاق احمد کشمیری نہیں تھے لیکن بہت عرصہ بلکہ اپنی نوکری کی شروعات سے لے کر سبکدوشی تک وہ کشمیر میں رہے اور کشمیر کے تہذیب وتمدن، زبان وادب اور کرکٹ کھیل کا ایک حصہ بن کر ہمیشہ سرخیوں میں رہے، وہ افسانے لکھتے تھے اور ان کے افسانے ملک کے مختلف جریدوں میں شائع ہوتے تھے۔ وہ ڈرامے بھی لکھتے تھے، انہوں نے ریڈیو کے لئے ان گنت ڈرامے لکھے جو مقبول بھی ہوئے، انہیں کھیلوں سے بڑی گہری دلچسپی تھی بلکہ وابستگی تھی۔ وہ کھیل کے میدان کے ایکسپرٹ تھے خاص طور سے کرکٹ ان کی کمزوری تھی، کھیل کے شائقین کے سامنے ان کی بڑی اہمیت تھی، کمنٹری کے لئے اکثر ادارے ان کی ماہرانہ آواز سے بھرپور استفادہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا۔

انہوں نے اپنی سروس کا آغاز گورنمنٹ پالی ٹیکنک سے کیا اور بعد میں انجینئرنگ کالج میں تعینات ہوئے اور شاید اسی کالج سے سبکدوش بھی ہوئے اور پھر کشمیر چھوڑ کر چلے گئے۔ کشمیر میں ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں نہ صرف اساتذہ، ادیب وشاعر، قلم کار اور مصور شامل تھے بلکہ کھیل سے دلچسپی یا تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس فہرست میں شامل تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اب بھی حیات ہیں لیکن چند روز قبل کلچرل اکادمی کی ایک تقریب (بیادِ مرحوم اختر محی الدین) کے دوران ان کا ذکر چلا اور کشمیر کے اُبھرتے ہوئے ناقد اور قلم کار سلیم سالک نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ آفاق

حمد اب حیات نہیں ہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی ان سے واقف تھا، میرے برادر اصغر مرحوم محی الدین شاہ کے ساتھ ان کے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ دراصل دونوں نے کشمیر پالی ٹیکنک سے اپنی سروس کا آغاز کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''آخری اسکور'' ان کے تحریر کردہ اس جملے کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔

بھائی نور شاہ کے لئے

اس توقع کے ساتھ کہ وہ اپنے گرانقدر مشوروں سے مجھے نوازیں گے۔

آفاق احمد

10/اکتوبر 1983ء

''آخری اسکور'' میں دس طویل اور دس مختصر افسانچے شامل ہیں۔ یہ افسانے ان کے وسیع مشاہدے اور قوت اظہار کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ تیز رفتار زندگی کا کھوکھلا پن اور ناآسودگی اور دوسرے مسائل ان کے افسانوں کے موضوعات رہے ہیں۔

ان کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں آج کے کالم میں ان کے دو افسانچے پیش کررہا ہوں۔

پہلا افسانہ:

حرامی:

سیٹھ دین دیال کو مرے ہوئے صرف چار برس ہوئے تھے کہ گلی محلّہ کے لوگوں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلیں اور تو اور ایک دن محلّہ کے آوارہ لڑکوں نے ان کے اکلوتے بیٹے کو حرامی کہا۔

وہ ننھی سی جان روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور محلے کے بچوں کی شکایات کرنے لگا۔

ماں نے سیٹھ صاحب کے خوب رو سیکریٹری کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بیٹے کے آنسو پونچھتے ہوئے سمجھانے لگی۔

''ان کو بکنے دو بیٹے، جس کا باپ زندہ ہو لوگ اسے حرامی نہیں کہتے۔''

دوسرا افسانچہ:

تدفین:

ایک دن زندگی سے تنگ آکر میں نے خود کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وقت کے فیتہ سے خود کو ناپا اور اسی حساب سے قبر کھودنی شروع کردی۔ جب قبر کھد کر تیار ہوگئی تو مجھے خیال آیا کہ میں اگر دفن ہوگیا تو میرے گناہ باہر رہ جائیں گے۔ ان کو بھی اپنے ساتھ دفن کرنے کے ارادے سے میں نے قبر کو اور گہرا کرنا شروع کردیا...... ہاتھ پیر شل ہوگئے، کمر دوہری ہوگئی اور تب کہیں قبر اس لائق ہوئی کہ میرے دانستہ گناہ اس میں دفن ہوسکتے، دو گھڑی سانس لے کر میں اس گہری اور تاریک قبر میں اترنے ہی والا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ میں اپنے ادھورے خواب کیوں اس دنیا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دوں...... یہ سوچ کر قبر کو اور گہرا کرنا شروع کردیا اور اس وقت تک کھودتا رہا جب تک میں بے دم ہو کر گر نہیں گیا...... اور پھر لوگ میرے جسم کے کھوکھلے تابوت کو اپنے لاغر کاندھوں، پر اٹھا کر اپنی ذہنیت کی طرح تنگ ایک نئی قبر میں دفن کر آئے......!!!

✿✿✿

60

میرا سپنا بیت گیا

ادبی اور فلمی دنیا کے مقبول و معروف شاعر راجہ مہدی علی خان کا تعلق وزیر آباد (اب پاکستان) کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا، وہ وزیر آباد میں ہی 1928ء میں پیدا ہوئے ان کی والدہ حمیدہ بیگم بھی اپنے دور کی ایک سنجیدہ شاعرہ تھیں اور ان کی شعری تخلیقات اخباروں اور رسائل میں شائع ہوتی تھیں، ان کا مجموعہ کلام ''نوائے حرم'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ اس تعلق سے راجہ مہدی علی خان کو شاعری کی تربیت ماں کی گود میں ہی نصیب ہوئی، ایسے ماحول میں راجہ صاحب نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آس پاس یا تو کتابیں دیکھیں یا قلم کاروں، شاعروں اور ادیبوں کے ان گنت چہرے، واہ واہ کی صدائیں بھی سنائی دیتی ہوں گی۔ لہذا ان کے لئے شاعری کے میدان میں کودنا ایک فطری عمل تھا۔

راجہ مہدی خان زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن بطور شاعر وہ اپنا ایک مقام بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کا کلام مختلف اخباروں اور جرائد میں شائع ہوتا تھا، لہٰذا جب کبھی بھی انہوں نے ملازمت کے لئے درخواست دی تو ہاتھوں ہاتھ قبول ہوتی گئی۔ ان کے ماموں ظفر علی خان اخبار ''زمیندار'' شائع کرتے تھے، شروع شروع میں اسی اخبار میں بحیثیت صحافی اپنی خدمات انجام دیں پھر اخبار ''انقلاب'' میں آگئے۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر راجہ مہدی علی خان کی شاعری کے شیدائی تھے اور چھوٹے بڑے موقع پر ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔

راجہ مہدی علی خان 1945ء میں وزیر آباد سے دہلی چلے آئے اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی، بعد میں معتبر شاعر آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی

کے کہنے پر فوج میں بھرتی ہو گئے ۔ 1946 ء میں سعادت حسن منٹو نے راجہ صاحب کو فلموں میں گیت لکھنے کے لئے ممبئی مدعو کیا۔ اگر چہ پہلے پہل فلمی دنیا میں راجہ صاحب کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہیں اُسی برس دو فلموں ''دو بھائی'' اور ''آٹھ دن'' میں گانے لکھنے کا موقعہ ملا۔ فلم ''آٹھ دن'' کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے ، کہانی سعادت حسن منٹو کی تھی، فلم کے گانے مقبول تو ہوئے لیکن راجہ صاحب کو فلمی حلقوں میں شہرت نہ مل سکی ۔ جب 1947 ء میں ''دو بھائی'' ریلیز ہوئی تو انہیں فلمی دنیا میں ایک پہچان مل گئی ، راجہ صاحب موسیقار مدن موہن کے پسندیدہ گیت کار تھے ۔انہوں نے راجہ صاحب کو فلم ''آنکھیں'' کے لئے گیت لکھنے کو کہا۔ 1950 ء کی بات ہے، اسی سال راجہ مہدی علی خان نے زیب النساء سے شادی کی ، وہ خود بھی شاعرہ تھیں ۔شادی کے بعد راجہ صاحب کو شہرت ملی اور دولت بھی لیکن 1952 ء سے 1960 ء تک کا زمانہ راجہ صاحب کو راس نہ آیا، بیوی سے اَن بن ہوئی اور پھر طلاق...... ان دونوں کی واحد اولاد نیلوفر ماں کے ساتھ رہنے لگی ، راجہ صاحب تنہا رہ گئے اور مئے خانوں میں نظر آنے لگے ۔ بعد میں راجہ صاحب نے طاہرہ نامی خاتون سے دوسری شادی کی ۔ 1955 ء میں سعادت حسن منٹو انتقال کر گئے اور اس طرح راجہ صاحب ایک پر خلوص دوست اور رہنما سے محروم ہو گئے ۔ 1960 ء میں راجہ صاحب نے ایک بار پھر فلمی گیت نگاری شروع کی، ان کو موسیقار مدن موہن کا ساتھ ملا۔ مدن موہن نے راجہ صاحب کے تحریر کردہ گیتوں کے لئے شاندار اور دلفریب دُھنیں ترتیب دیں۔

میری یاد میں تم آنسو نہ بہانا
نہ دل کو جلانا مجھے بھول جانا......!!

یہ شعر سنئے:

تو جہاں جہاں چلے گا
میرا سایہ ساتھ ہوگا

راجہ مہدی علی خان کے گیتوں کو جن دوسرے موسیقاروں نے اپنی

دھنوں سے سنوارا، سجایا ان میں نوشاد علی، ایس ڈی برمن اور لکشمی کانت پیارے لال کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان گیتوں کو لتا منگیشکر، محمد رفیع، مکیش، طلعت محمود اور آشا بھونسلے نے اپنی آواز دے کر امر کر دیا۔

راجہ مہدی علی خان ماہنامہ بیسویں صدی کے مدیر خوشتر گرامی کے بہت ہی قریبی دوستوں میں سے تھے، وہ کسی زمانے میں بیسویں صدی کے لئے ایک کالم لکھتے تھے اور اس کالم میں بیسویں صدی میں شائع ہونے والے قلمکاروں کا تعارف اپنے ڈھنگ سے کرتے تھے۔ (اس کا ذکر میرے کالم ''میری ڈائری کا ایک ورق'' میں آچکا ہے۔)

زندگی کے آخری دنوں میں راجہ مہدی علی خان بیمار رہنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ان سے اپنوں نے نظریں چرالیں۔ 18 / دسمبر 1966ء کو ان کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ ان کے شعری مجموعے ہیں...... مضراب، اندازِ بیاں اور آخری نظمیں !!

جو ہم نے داستان اپنی سنائی آپ کیوں روئے

تباہی جو ہمارے دل میں آئی آپ کیوں روئے

❁❁❁

61

ایک بیکراں سمندر

کندن لال سہگل اپریل 1904ء میں جموں میں پیدا ہوئے لیکن جب ان کے والد بحیثیت تحصیلدار سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے جموں چھوڑ کر جالندھر میں سکونت اختیار کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ سہگل کو ڈوگرہ اور کچھ لوگ پنجابی تصور کرتے ہیں۔ بہر حال اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ سہگل کی پوری زندگی موسیقی، فن اور اداکاری سے عبارت تھی۔ اگرچہ انہوں نے صرف 42 برس کی عمر پائی اور 18 ر جنوری 1946ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے لیکن اپنی مختصر سی عمر میں فلمی دنیا کی مقبول ترین آواز کے طور پر فن کی بلندیوں کو چھوا۔

کہا جاتا ہے کہ سہگل کو بچپن سے ہی موسیقی میں دلچسپی تھی، وہ کمسنی میں ہی موسیقی کے رسیا تھے۔ سہگل کی اس دلچسپی اور اس کے اندر پوشیدہ فنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں اُس کی ماں نے ایک اہم رول ادا کیا وہ سہگل کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان چکی تھی۔ سہگل کے پتاجی کو موسیقی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کی یہ دلچسپی رام لیلا تک ہی محدود تھی، اس کی شاید یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی فائلوں کے درمیان گذاری تھی۔

فلموں میں اپنی آواز دے کر کندن لال سہگل نے زندگی کی تلخی میں مٹھاس گھول دی اور آج بھی ان کی آواز سن کر محسوس ہوتا ہے جیسے زمین کو صاف و شفاف پانی سے دھو کر نکھارا گیا ہو۔ قدرت نے انہیں جس فیاضی سے ایک شریں اور سریلا گلا بخشا تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ مجھے ایک بہت پرانا واقع یاد

آرہا ہے، تب سے بہت مدتیں گزر چکی ہیں۔ میرے دو قریبی دوست حکیم محمد طاہر (سابق وائس چانسلر اگریکلچر یونیورسٹی) اور پیر زادہ محمد امین (سابق ڈائریکٹر ایگریکلچر) لدھیانہ میں زراعت سے وابستہ کسی ٹریننگ کورس میں مصروف تھے۔ طاہر صاحب مرحوم حکیم منظور کے برادر اکبر ہیں۔ ایک دن حکیم منظور اور میں نے ان کے ہاں لدھیانہ جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم چار روز ان کے ہاں ٹھہرے، وہاں انہوں نے ہمیں ایک نوجوان سے ملایا وہ ٹیلرنگ کا کام کرتا تھا لیکن گاتا خوب تھا۔ طاہر صاحب نے یہ کہتے ہوئے ان کا تعارف کرایا ''کندن لال سہگل تو اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ہمارے یہ دوست اس دور کے کندن لال سہگل ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ شروع ہو گئے اور انہوں نے سہگل کے گائے ہوئے کئی گانے سنائے۔ ان کی آواز میں واقعی مٹھاس اور گداز تھا۔ گانا گاتے وقت وہ سہگل کے سریلے پن کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے اور جب موسیقی کی یہ محفل اختتام پذیر ہوئی تو طاہر نے چھوٹے بھائی کی جانب شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ ان کی رائے جاننا چاہتے تھے، حکیم منظور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ''آپ کا ٹیلر ماسٹر اس دور کا بہت بڑا فنکار تو ہو سکتا ہے لیکن کندن لال سہگل ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا۔'' (ٹیلر ماسٹر کا دل رکھنے کے لئے انہوں نے یہ بات کشمیری میں کہی تھی۔) اس واقعے کے پسِ منظر میں، میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ کندن لال سہگل جیسے گلوکار اور فن کار ایک ہی بار جنم لیتے ہیں، ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں۔ آج تک کوئی دوسرا سہگل پیدا نہ ہو سکا۔ سہگل آج حیات نہیں لیکن آج بھی وہ دُھنوں اور لفظوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر پرانی فلمی گیتوں کے سہارے راج کر رہا ہے۔ فلم شاہجہان اور دیوداس میں سہگل کے گائے ہوئے گانے دہائیاں گذرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہیں، ان کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے، سہگل کی آواز کی موسیقی پائل کی زنجیر بن چکی ہے۔

وہ اداکار بھی تھے، انہوں نے بہت ساری فلموں میں کام بھی کیا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے لیکن بطور فلم اداکار وہ زیادہ معروف نہیں ہیں۔ ان کی آواز کے سامنے ان کی اداکاری دب سی جاتی ہے لیکن اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ فلم دیودس میں دیوداس کا رول انہوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے۔ دلیپ کمار نے فلم دیوداس میں کام کرنے سے پہلے سہگل کی دیوداس کئی بار دیکھی تھی۔ شاہ رخ خان نے اعتراف کیا تھا کہ دیوداس میں رول کرنے کے لئے انہوں نے کندل لال سہگل اور دلیپ کمار کی دیوداس کئی بار دیکھی تھی۔

سہگل غیر بنگالی ہوتے ہوئے بھی بنگالیوں میں مقبول تھے۔ انہوں نے غالب اور دوسرے کئی شعراء کے کلام کو اپنی آواز دے کر اُردو زبان سے ناآشنا لوگوں کو اس زبان کی شیرینی، نفاست اور نزاکت سے روشناس کرانے میں مدد کی۔

سہگل کی ذاتی زندگی شاعرانہ تھی اور انہیں مئے ناب سے کافی رغبت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جوتشیوں سے انہیں کافی لگاؤ تھا۔ جوتشی تو جنم کنڈلی بنا سکتے ہیں، وقت کے لحاظ سے اس میں ہیر پھیر بھی کر سکتے ہیں لیکن عمر دراز دینے یا دلوانے میں ان کا کوئی رول نہیں بنتا ورنہ سہگل کم عمری میں نہ مرجاتے۔ خلیل جبران نے کہا ہے ؎

منش تب تکمیل کی حدود کو چھوتا ہے
جو وہ محسوس کرے کہ وہ لامحدود کائنات ہے
اور ایک بیکراں سمندر ہے......!!!

۞۞۞

حُسن اور سچائی کا پرستار

کیٹس کا کہنا ہے کہ سچائی کا نام حُسن ہے اور حُسن کا نام سچائی۔ اگر اس ایک جملے کے پسِ منظر میں قتیل شفائی کی شاعری کو پرکھا جائے تو اِس میں حُسن بھی ہے اور سچائی بھی ...... 2001ء میں گیارہ جولائی کو برصغیر کے ممتاز شاعر جناب قتیل شفائی انتقال کر گئے۔ تقسیم ملک کے بعد اُردو شاعری میں جن ناموں نے ادبی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کیا اُن میں قتیل شفائی کا نام خاصا مقبول و محبوب ہے، قتیل کی شاعری میں ایک بے انتہا وسعت ہے، انھوں نے نظمیں لکھیں، غزلیں، گیت اور آزاد غزل بھی، وہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور شعر و ادب کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک اُن کا برابر تعلق رہا بلکہ یوں کہنا چاہئے وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت کا ایک اور بھی پہلو تھا۔ وہ کسی بھید بھاؤ یا تعصب کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور یار دوستی میں پوری مساوات کے قائل تھے، اُن کے لئے دوستی اور عشق ایک برابر تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی صاف و شفاف تھی، شہرت، دولت اور اثر ورسوخ کے باوجود وہ نہ تو مغرور تھے اور نہ ہی متکبر، وہ انسانیت کے علم بردار تھے اور انسانی اصولوں کے پرستار......!!

قتیل شفائی کا اصل نام اورنگ زیب خان تھا۔ وہ 24؍دسمبر 1919ء کو صوبہ سرحد کے ہری پورہ ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ 1936ء میں اپنے لئے قتیل کے تخلص کا انتخاب کیا اور اپنے استادِ گرامی حضرت شفا کی نسبت سے شفائی کے لفظ کا اضافہ کیا۔ اُن کی پہلی شعری تخلیق 1936ء میں شائع ہوئی، اُن کی وفات تک اُن کے چودہ شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے، اُن کے شعری مجموعہ ''مطربہ'' جو

1964ء میں منظر عام پر آیا کو پاکستان رائٹرز گلڈ نے آدم جی ایوارڈ سے نوازا۔ اس کتاب میں جو منظومات شامل ہیں وہ زندگی کی تلخیوں، شیرینیوں، اچھائیوں اور برائیوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

شعر سنیئے ۔

تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دوکان
اس میں ایک شاعر نادار کی توقیر کہاں
یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زبان
نہ تو ممتاز بنے اور نہ میں ہی شاہجہان
پھر کوئی تاج محل کس کے لئے
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے......!!!

قتیل شفائی نے اپنی شاعری میں ہمیشہ حُسن کی عظمت اور وقار کو قائم رکھا گیت اور غزل کو فن کی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ وہ خود کہتے تھے......''ایک فنکار کے لئے انسان دوستی اس کی سب سے بڑی پہچان ہے......شاید اسی وجہ سے اُن کی دوستی کا حلقہ بہت وسیع تھا، وہ اپنے ملک پاکستان میں مقبول تو تھے ہی، ہندوستان میں بھی اُن کے ان گنت شیدائی اور چاہنے والے تھے۔ ممبئی کی فلم انڈسٹری سے بھی اُن کی وابستگی تھی، ہندوستانی شاعروں میں اُن کا نام بے حد معروف تھا۔

قتیل شفائی کی شادی 1936ء میں ہوئی!

اُن کا ایک بیٹا تنویر اور سب سے چھوٹی بیٹی پنجابی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔

قتیل شفائی کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''جب بیسویں صدی کے چند اہم اور بڑے شاعروں کی فہرست تیار ہوگی تو اس میں قتیل شفائی کا نام بہر صورت شامل ہوگا کہ قتیل نہ صرف حُسن اظہار کے بارے میں بلکہ حُسن فکر کے معاملے میں بھی بڑا غیر فانی شاعر ہے۔''

بقول ڈاکٹر ظفر مراد آبادی اُردو کی شاعری کی تاریخ میں سب سے مختصر نظم لکھنے کا سہرا بھی قتیل شفائی کے سر ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ قتیل شفائی کے گیتوں میں عورت ایک پنچھی کی طرح اُبھرتی ہے جسے تازہ پر عطا ہوئے ہوں لیکن جو ابھی اُڑنے کے قابل نہ ہوئی ہو تاہم جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نغمے میں ایک انوکھی جھنکار کا اضافہ کرتی ہے۔

آکاش کے چاند کو آنے دو
دھرتی کے چاند کو آنے دو
ایک چاند گیا ایک چاند آیا

قتیل شفائی نثر بھی خوب لکھتے تھے، انہوں نے کئی افسانے لکھے جو ماہنامہ ساقی اور ماہنامہ سنگ میل میں شائع ہوئے۔ وہ ادبِ لطیف جیسے معیاری رسالے کے مدیر بھی رہیے، وہ کچھ عرصہ فلمی رسالہ ''اداکار'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے لیکن دراصل شاعری اُن کی پہلی اور آخری پسند تھی۔

ساحر لدھیانوی نے قتیل شفائی کے بارے میں کہا تھا:

''قتیل شفائی پاکستان کا ساحر لدھیانوی ہے اور ساحر لدھیانوی ہندوستان کا قتیل شفائی وہ اس لئے کہ ہم دونوں کے شعری رویوں میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

مجھ سے رکھتے ہیں قتیل اس لئے کچھ لوگ حسد
کیوں میرے شعر ہیں مقبول حسیناؤں میں

✿✿✿

63

ایک روشن ستارہ

میر شمس الدین حیرت پاندانی 1308 ہجری میں میر مختار پاندانی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ میر مختار صاحب خود فارسی زبان کے ایک معتبر شاعر تھے، شاعری کے علاوہ اُنہیں علمِ نجوم میں گہری دلچسپی تھی۔

میر شمس الدین نے ابتداء میں مذہبی، اخلاقی اور قرآنی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اس کے ساتھ ہی انہوں نے مفتی صدر الدین فاروقی، مفتی حسام الدین جامعی اور قاضی غلام محی الدین جیسے عالموں اور بزرگوں سے درسی تعلیم حاصل کی۔ اُن کی سرپرستی نے حیرت صاحب کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ علم جعفر انہوں نے خواجہ غلام محمد ترنبو سے حاصل کیا، ترنبو صاحب حسرت صاحب کی قابلیت، شرافت اور سادگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کو اُن کے نکاح میں دیا۔

میر شمس الدین نے ابتداء میں اپنا تخلص شمس رکھا تھا۔

1338 ہجری میں اُن کی ملاقات مولانا فطرت کاشمیری سے ہوئی۔ وہ بھی فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن انہوں نے تخلص کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ دونوں نے مل کر تخلص کے بارے میں مفصل گفتگو کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں دیوانِ حافظ کا سہارا لینا چاہا لیکن دیوان حافظ دستیاب نہ ہوا، پھر انہوں نے دیوانِ بیدل کی ورق گردانی کی۔ مولانا فطرت کاشمیری نے اپنے نئے فطرت کا انتخاب کیا اور میر شمس الدین نے اپنے لئے حیرت......!!

مولانا فطرت کاشمیری اپنے ایک مختصر سے مضمون میں لکھتے ہیں:

"حیرت صاحب کا فارسی کلام بے حد سلیس لیکن پُر درد اور پُر سوز ہے۔"

حیرت صاحب مجموعی طور پر خوش مزاج تھے، نیک خیال اور پاکیزہ اِخلاق سے سرشار تھے، مہمان نواز تھے اور دوست نواز بھی۔ حیرت صاحب کی کشمیری زبان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے، اس شاعری کی جڑیں گہری ہیں، اُن کے کلام میں انسان دوستی کے نقوش نظر آتے ہیں اور حق پرستی کی تصویریں ملتی ہیں، اُن کی شاعری نمائش اخلاق سے بہت دور ہے۔

میر شمس الدین حیرت پاندانی 6 دسمبر 1968ء کو انتقال کر گئے اور انہیں اپنے خاندانی قبرستان پاندان میں سپرد خاک کیا گیا......!!

❁❁❁

64

محبتوں کا پیامبر

ہماری ادبی دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔ یہ لوگ شاعر انسان کہلاتے ہیں، ایسے ہی شاعروں کی فہرست میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام بھی نظر آتا ہے۔ محبت اِن کی زندگی کا سب سے بڑی قوت رہی ہے۔ اُنہیں انسانیت پر یقین تھا اور تعصب سے اُن کا دل پاک تھا، اُن کی ذات ہمہ جہت تھی، ایک ایڈمینسٹیٹر ہونے کے باوجود وہ ایک دردمند اور مخلص انسان تھے۔ خوش گفتار بھی تھے۔

کنور صاحب 9/مارچ 1909ء کو منٹگمری میں پیدا ہوئے۔ 1914ء سے لے کر 1919ء تک منٹگمری میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد 1925ء تک لاہور میں تعلیم حاصل کی، 1925ء میں سینئر کیمبرج کا ڈپلوما حاصل کیا۔ 1929ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1933ء میں شادی کی اور 1935 میں روتھک میں بحثییت مجسٹریٹ تعیناتی ہوئی، اور آخر میں 1964ء میں بحثییت ڈائریکٹر پنچایت پنجاب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے، ملازمت کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد بھی وہ مختلف سماجی اور ادبی اداروں کے روح رواں رہے اور ہمیشہ اِن اداروں کی سرگرمیوں میں جوش اور جذبے سے حصہ لیتے رہے۔

سحر صاحب کی شاعری کا کینواس بہت وسیع ہے، شاید کوئی بھی ایسی صنف نہیں جس میں انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ غزل اُن کی محبوب ترین صنف رہی ہے۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کو عام فہم اور

بامحاورہ الفاظ اور جملوں سے سجایا ہے ؎

آنکھ میں پانی دل میں آگ
یہ سب اپنے اپنے بھاگ

شاعر تو وہ کمال کے تھے ہی لیکن بزلہ سنجی لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں بھی کنور صاحب کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بہت اچھے نثر نگار بھی تھے۔ شگفتہ اور دل آویز نثر لکھنے میں اُنہیں قدرت حاصل تھی۔ اُن کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کا جشن'' پڑھ کر اس کا ثبوت مل جاتا ہے۔ انہوں نے قلمی خاکے بھی لکھے ہیں۔ انسان کو بہتر زندگی سے روشناس کرانا ان کی شاعری کا مقصد تھا ؎

مائل دیر و حرم تو نے یہ سوچا بھی کبھی
زندگی خود ہی عبادت ہے اگر ہوش رہے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے انتقال سے اُردو شاعری میں واقعی ایک خلا پیدا ہو گیا ہے......!!!

✿✿✿

65

خبر و نظر کا بانی

حکیم منظور نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے منتظم تھے بلکہ اُردو اور کشمیری زبان و ادب میں بحیثیت ایک شاعر، قلم کار اور صحافی اُن کا ایک منفرد مقام تھا۔ انہوں نے اپنی شعری تخلیقات میں نئے موضوعات کے دروازے وا کئے، نئے نئے خیالات کا ساتھ دیا۔ نئے استعاروں کا استعمال کیا اور شعری ادب میں معنی خیز پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ جب وہ حیات تھے تب بھی اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف قلم کاروں نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔ اُن کے لہجے کی صداقت اور صلاحیت کو قارئین کے سامنے رکھا، حکیم منظور کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ادب کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے (حالانکہ بہت سارے ریاستی اور غیر ریاستی سیاست دانوں سے اُن کے قریبی مراسم تھے) وہ ادب کو سیاست کی دست درازیوں سے دور رکھنے کے قائل تھے وہ فنکار کو سیاست کار سے بڑا درجہ دیتے تھے اور اہمیت بھی۔ حکیم منظور ادبی کثافت کے خلاف تھے۔

میرا قد منظور اُن اُونچے سفیدوں کی طرح
میرے شعروں میں وُلر کے جھیل کی سی تازگی

خبر و نظر، اُن کا اخبار تھا جو اُن کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اُن کی ادارت میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا (اور اُن کی وفات کے بعد اس کی اشاعت بند ہوگئی۔) اپنے اخبار ''خبر و نظر'' کے اشتراک سے انہوں نے جموں و کشمیر رائٹرس کونسل کی بنیاد ڈالی (یہ ادبی ادارہ بھی اب ریاست کی دوسری ادبی اداروں کی طرح اخبارات کی سرخیوں میں بھی نظر نہیں آتا) حکیم منظور کی صدا

ت میں اس کونسل نے 2رنومبر 2002ءکوایک ادبی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں اچھی خاصی تعداد میں اُردو اور کشمیری زبانوں سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں نے شرکت کی۔ اپنے خیالات کا اظہار کیا، اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ کونسل کی سرگرمیوں کو موثر بنانے کے لئے تجاویز پیش کیں لیکن اس کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایک قلم کار کو اس کی حیثیت اہمیت اور صلاحیت کا احساس دلایا جائے تا کہ وہ سیاست، سیاست کار یا سرکار سے دور رہ کر بھی اپنے منصب سے انصاف کر سکے، ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قلم کار کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی زبان کو مخصوص علاقے سے مختص کیا جاسکتا ہے۔ اس پسِ منظر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''اُردو دنیا میں بولی جانے والی زبانوں میں چھٹے نمبر پر ہے ہندی اب پورے ہندوستان میں پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ اسی طرح کشمیری بھی پورے ہندوستان میں بولی اور پڑھی جاسکتی ہے بشرطیکہ ہم اس ضمن میں اپنی پر خلوص کوششیں وقف کریں ممکن ہے کہ اِس وقت یہ دیوانے کا خواب معلوم ہو لیکن اگر اس زبان کو دیوانے اور جیالے مل گئے تو یہ حقیقت بھی بن سکتا ہے کشمیری ہماری مادری زبان ہے اِسے فروغ دینا ہمارا اخلاقی اور تمدنی فرض ہے کشمیری زبان کشمیر اور کشمیریوں کی شناخت ہے اور اس شناخت کو قائم دائم رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ ریاست کے دوسرے حصوں کے لوگوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کا تحفظ کریں۔ اس کی ترویج واشاعت جاری رکھنے کی کوشش کریں۔ اُردو نہ صرف یہ کہ سرکاری زبان ہے بلکہ تہذیبی اور تمدنی حقائق کے پسِ منظر میں رابطے کی زبان کا کردار ادا کرتی رہی ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ یہی زبان ریاست کے اتحاد کی

ضمانت ہے، اس لئے اُردو اور کشمیری یا کسی دوسری زبان کے درمیان
دوری پیدا کرنا ہمارے نزدیک دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

یہ تھی اُردو کے معروف اور معتبر شاعر حکیم منظور کی سیاست، سیاست کار، زبان وادب اور فنکار کے بارے میں اُن کے خیالات کی ایک جھلک...... زبانوں کے تعلق سے حکیم صاحب کے خیالات قابلِ ستائش ہیں۔ اچھی سوچ ہمیشہ قائم و دائم رہتی ہے۔ حکیم منظور اب ہمارے درمیاں نہیں لیکن ہم اُن کی اچھائیوں کو اپنا تو سکتے ہیں، ادب کو سیاست اور سیاست دانوں سے دور تو رکھ سکتے ہیں؟ کشمیری اور اُردو میں لکھنے والوں کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم تو کر سکتے ہیں؟ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے تنگ دلی کی آگ کو بجھا کر اپنے ذہنوں کو کشادہ کرنا پڑے گا۔

بے تسلی کرم صفت چہرے
گھر کشادہ بہت مگر دل تنگ......!

حکیم محمد منظور 17/ جنوری 1937ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے اور 21/ دسمبر 2007ء کو گوڑگاؤں (ہریانہ) میں انتقال کر گئے۔ اُنہیں سرینگر میں اُن کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا......!!

❁❁❁

پھول کھلنے سے پہلے

جب میں اپنی یاداشت پر تیر چلانے کی کوشش کرتا ہوں یا یوں کہیے اپنے شعور سے نکل کر لاشعور میں جھانکتا ہوں یا جس بات کو یاد کرنے کے لئے اپنے من کی آنکھیں بند کر لیتا ہوں تب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا طویل سفر اختتام پزیر ہے، تب سے اپنے کشمیر میں کتنے رنگ آئے اور بکھر کر مٹ گئے۔ کتنے سیلاب آئے اور اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے گئے۔ ہماری سوچوں، نظریوں اور جذبات واحساسات میں کتنی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس دوران ہماری وادی میں بھی کتنے موسم آئے اور اپنا رُخ بدلتے بدلتے سبزہ زاروں کو ریگ زاروں میں بدل گئے۔

اس پسِ منظر میں اس وقت جو تصویر میری نگاہوں کے سامنے اُبھر رہی ہے وہ ایک ایسے شخص کی ہے جو اپنی جوانی کی دہلیز پر کھڑا ہے اور اپنے شادابی چہرے کی بدولت ماحول کو پرنور بنا رہا ہے...... اور یہ تصویر محمد امین اندرابی کی ہے۔ میں جب بھی امین صاحب کو یاد کرتا ہوں تو یہی ایک تصویر میرے سامنے اُبھر آتی ہے اس کی ایک وجہ ہے۔ مجھے پہلی بار محمد امین اندرابی کو اسی انداز میں سرینگر کے تھانہ کوٹھی باغ میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُن کی جوانی کے دن تھے (اور کسی حد تک میرے بھی لیکن میری عمر اُن کی عمر سے بہر حال زیادہ تھی)۔ وہ اُن دنوں کشمیر یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے اور یونیورسٹی میں کوئی ایجی ٹیشن چل رہی تھی، ایک سرگرم کارکن ہونے کی پاداش میں اُنہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ فاروق نازکی اور ایک خاتون

اُن سے ملاقات کرنے کے خواہش مند تھے، اُن دنوں علی محمد وٹالی صاحب شہر سرینگر کے ایک اہم پولیس آفیسر تھے۔ میں نے اُن سے بات کی اور انہوں نے دوستی کی لاج رکھتے ہوئے فوراً ہی بلکہ اُسی سمے ملاقات کرنے کی اجازت دی۔ اُس وقت وہ خاتون برقعے میں تھیں۔ میں اُنہیں دیکھ نہ سکا۔ کچھ روز بعد امین صاحب کوٹھی باغ تھانہ کے سلاخوں سے باہر آئے اور اُن سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ ان مختصر مختصر سی ملاقاتوں میں مجھے اُنہیں قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ اُن کی (فاروق نازکی سے قریبی دوستی کے باوجود) شرافت تھی۔ یہاں تک کہ اُن کا لہجہ بھی شریفانہ تھا۔ وہ بات کرتے تھے تو لگتا تھا جیسے پھول کھل رہے ہوں، وہ علمی اور ادبی سمندر جو اُن کے دل و ذہن میں تھا ٹیس مارتا تھا اکثر اُن سے گفتگو کرنے کے دوران لگتا تھا جیسے اپنی بات نہایت خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے بعد شانت ہو گیا ہے وہ خود مسکراتا تھا اور دوسروں کو مسکرانے کا سلیقہ بھی جانتا تھا وہ دوسروں پر اپنے مخصوص اور ٹھہرے ٹھہرے سے انداز میں طنز بھی کرتا تھا لیکن خود بھی طنز برداشت کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ ظاہری طور پر اس کا کوئی حریف نہ تھا ہوسکتا ہے کہ یونیورسٹی میں Professional سطح پر ایسے لوگ موجود رہے ہوں لیکن ایسے افراد بھی محمد امین اندرابی کی خاندانی اور ذاتی شرافت، اُن کے نظریات اُن کے خیالات، اُن کے انداز گفتگو اور انداز تحریر سے بے حد متاثر تھے۔

میں نے جس خاتون جی ہاں برقعہ پوش خاتون کا ذکر کیا اُن کے بارے میں بھی بتاتا چلوں وہ اب نصرت اندرابی کے نام سے جانی جاتی ہیں، جی ہاں بیگم نصرت امین اندرابی...... امین صاحب کی گھر جنت، نصف بہتر، تعلیمی اور سماجی میدان میں اُن کا اپنا ایک نام ہے، ایک مقام ہے۔

مجھے اندرابی صاحب کی ایک اور بات یاد آرہی ہے، اس کا تعلق میری ذات سے ہے، کشمیر یونیورسٹی میں ریاض احمد نامی ایک طالب علم میرے افسانوں پر ایم۔فل کررہا تھا انہوں نے اپنی تھیسس پیش کی جو تجزیہ کے لئے امین صاحب کو سونپ دی گئی ۔ ایک روز عبداللہ نیوز ایجنسی کے قریب اُن سے اچانک ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس تھیسس کا ذکر چھیڑا۔ وہ مطمئن نہیں تھے اس لئے منظور کرنے کے حق میں بھی نہیں تھے، اپنی رائے دینے سے پہلے وہ میری رائے جاننا چاہتے تھے، میں نے اُن سے کہا جب آپ بحیثیت ایک اُستاد ایک ناقد اور قلم کار مطمئن نہیں ہیں تو یہ تھیسس ہر صورت میں reject ہونی چاہیے اور پھر ایسا ہی ہوا (اگر ریاض صاحب کو یہ تحریر پڑھنے کا موقع ملے تو اُن سے استدعا ہے کہ میری کتابیں لوٹا دیں)۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مرحوم امین صاحب کا بڑا اپن تھا کہ تھیسس reject کرنے سے پہلے مجھے بھی اپنے اعتماد میں لے لیا۔

اُن کی علمی اور ادبی زندگی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ابھی بھی کچھ ایسے پہلو ہیں جن پر لکھنے کی ضرورت ہے اور یہ کام ناقدوں کا ہے، کشمیر یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں کا ہے۔ یہاں میں اس بات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ کشمیر یونیورسٹی میں بحیثیت ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ اُنہوں نے علامہ اقبال کی شخصیت کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جن کی جانب کم توجہ دی گئی تھی ۔اس سلسلے میں اُنہوں نے کئی کامیاب سمیناروں کا انعقاد بھی کیا۔

پھول کھلتے ہیں اور مرجھا بھی جاتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ محمد امین اندرابی ایک خوشنما، خوش رنگ پھول کی طرح کھلے تو ضرور لیکن وقت سے پہلے ہی مرجھا گئے ....!!!

❁❁❁

نور شاہ میری نظر میں

نور شاہ وادی کشمیر کے بزرگ ادیبوں میں سب سے فعال ادیب مانے جاتے ہیں۔ یہ واحد افسانہ نگار ہیں جو ایک طویل عرصہ سے ہندوستان بھر کے معتبر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ہر تحریر انسانی ہمدردی اور دردمندی سے مملو ہوتی ہے۔ خود ان کی شخصیت بھی کسی بھی قسم کے تکبر اور انانیت سے دور ہے اور یہی شئے ان کو نہ صرف اپنے ساتھیوں میں مقبول بنائے ہوئے ہے بلکہ ان کے دشمن بھی اس خوبی کے معترف ہیں۔ شخصیت کا یہ روشن رُخ ان کی تحریروں کو بھی ایک وقار بخشتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے وابستہ رہے ہیں لیکن یہ چیز بھی عام افسروں کے برعکس ان سے ان کی انسانیت نہیں چھین پائی۔ اس کا اندازہ نور شاہ سے میری پہلی ملاقات سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک مقامی روزنامہ کے ادبی صفحہ پر چھپے ان کے ایک افسانے پر میں نے شدید تنقید لکھی جو اسی روزنامہ میں چھپی۔ اس کے بعد تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ قیامت تک میرا نام بھی نہ لیتے۔ لیکن ان کا بڑا پن دیکھئے کہ وہ خود میری کلینک پر تشریف لائے اور محض چند منٹوں کے اندر اندر مجھے اپنا گرویدہ بنالیا اور میں اندر ہی اندر ان پر لکھی تنقید پر شرمسار ہوتا رہا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور اب حال یہ کہ اگر ایک دن بھی مجھ سے ملنے نہیں آتے تو میں فون پر اس کی شکایت کرتا ہوں۔ حالانکہ میری اور ان کی عمر میں بڑا فرق ہے۔ ان کی پُر اثر شخصیت اور ان کے محبت بھرے انداز نے عمر کے اس فرق کو بالکل مٹا کر رکھ دیا ہے۔

ان کی یہ تازہ کتاب مختلف شخصیتوں پر مبنی ایک تاثراتی کتاب ہے۔ جس میں ہر قسم کے قاری کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ کتاب بے شک دلچسپ ہے......!!

ابن اسماعیل
مدیر اعلیٰ ''بزمِ ادب'' سرینگر
سوپور، کشمیر

نورشاہ کی افسانوی انفرادیت

بے ثمر سچ کے پسِ منظر میں

یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ریاست میں نورشاہ ایک اہم افسانہ نگار ہیں جو تجربہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے میں بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تراشیدگی، شعریت آمیزی، طنز و تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے، اِس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ و پے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا ہے......!!!

پروفیسر حامدی کاشمیری (سرینگر)

❁❁❁

نورشاہ کی کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں جن میں نہ صرف یہاں کا حُسن اور خوبصوری اُمڈ آئی ہے بلکہ اُنہوں نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے عوام کے رستے ہوئے درد کا مداوا کیا ہے اس کی داد نہ دینا کور ذوقی ہوگی......!!!

ڈاکٹر پریمی رومانی (جموں)

❁❁❁

نورشاہ ایک جانب لفظوں، رنگوں، موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی لے، وائلن کی دُھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعے انتہائی لطیف انداز میں اپنے

احساسات کو واضح کرتے ہیں تو دوسری جانب زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی شد ومد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنتِ بے نظیر رہا بھی تو نہیں......!!!
ڈاکٹر شمع افروز زیدی (دہلی)

۞۞۞

نور شاہ فکری و جذباتی اعتبار سے کبھی کبھی ایک باغی کی طرح ہی ظلم و بربریت کے خلاف ایک ہاتھ میں پرچم اور دوسرے ہاتھ میں قندیل لئے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس جوش و جذبے کی فراوانی و جدت کے باوجود بھی انہیں روایات سے پاسداری کا احساس اور خیال بجا رہتا ہے، ان کی نثر نگاری میں ایک خوبصورت آہنگ بھی ہے اور دلفریب ترنم بھی ہے، ایک انقلابی جوش ہے اور ایک شاعر کا آہنگ بھی ہے......!!!
ڈاکٹر اشرف آثاری (سرینگر)

۞۞۞

اکثر تخلیق کاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے اوب جاتے ہیں یا ہوا دیکھ کر رُخ بدلتے ہیں اس کے برعکس نور شاہ پانچ دہائیوں سے مسلسل اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک ہونے کی بجائے رومان پرور اور معطر زینت سے خود کو سیراب رکھا اور اپنے ہی مسلک و مذہب پر قائم و دائم رہے......!!!

سلیم سالک (سرینگر)

......☆☆☆......

میری ڈائری کا ایک ورق

سلسلہ وار کالم۔ کشمیر عظمیٰ سرینگر

نور شاہ بحیثیت کالم نویس

(بند کمرے کی کھڑکی کے پسِ منظر میں)

میں نے بند کھڑکی اس طرح کھولی کہ صبح ہوگئی اور کھڑکی کھلی رہی جس خوبصورتی سے آپ نے اپنی ڈائری میں کشمیر اور جموں کے ادیبوں اور شاعروں کا احاطہ کیا ہے ایک صرف آپ نے کشمیر میں ادب کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے بلکہ تمام برصغیر کے سامنے ایک کامیاب تصویر پیش کی ہے۔ یہ کتاب کوئی مقالہ نہیں ہے بلکہ ایک حوالہ ہے اُن نوجوانوں کے لئے کہ وہ آگے بڑھیں اور مقالے زعفران میں قلم ڈبو کر تحریر کریں......!!!　　　اقبال مہدی (دہلی)

❁❁❁

تمہاری کھڑکی سے جتنا آسمان نظر آرہا ہے اس میں تمہارے کردار کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے تم بنیادی طور پر کتنے حساس ہو یہ صاف نظر آتا ہے، جو کچھ تمہارے آس پاس ہو رہا ہے تمہاری نظر سے بچ نہیں پایا، اچھی باتوں کی پزیرائی اور بے انصافی کے خلاف احتجاج بھی ہے......!!!

ویدراہی (ممبئی)

❁❁❁

ادبی ڈائری لکھنا ایک فن ہے، اس قسم کی ڈائریاں ماضی کو مجسم کر کے سامنے لا کھڑی کرتی ہیں جب میں نے نور شاہ کی ادبی ڈائری "بند کمرے کی کھڑکی" پڑھی تو میں جیسے جوان ہو گیا کیونکہ میرا ماضی مجسم ہو کر میرے سامنے رقص کرنے لگا......!!!　　　عبدالرحمان مخلص (سوپور کشمیر)

❁❁❁

آپ کی کتاب ''بند کمرے کی کھڑکی'' میرے لئے ایک دلچسپ تجربے سے کم نہیں خصوصاً اس لئے کہ اس میں وادی کا حسین ماضی قدم قدم پر جھانکتا ہے......!!!

جاوید رحمانی (دہلی)

✿ ✿ ✿

آپ کی کتاب بند کمرے کی کھڑکی پڑھ کر مزہ آیا، کتاب جو ہاتھوں میں لی تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نثر میں جہلم جیسا بہاؤ ہے، مواد میں شالیمار باغ کے پھولوں جیسا تنوع اور زبان میں چشمہ شاہی کے پانی جیسی مٹھاس ہے......!!!

دیپک بدکی (جموں)

✿ ✿ ✿

میرے سرہانے رفتہ رفتہ یادیں ہیں پڑی
بند کمرے کی کھڑکی کو کھلا رہنے دو......!!!

محمد حسین طائر (اننت ناگ کشمیر)

✿ ✿ ✿

اس کتاب کے اسلوب میں افسانوی رنگت جگہ جگہ نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ذہن بار بار کتاب پڑھنے پر اُکساتا ہے، حقیقتاً بند کمرے کی کھڑکی نور شاہ کی زندگی کے لمبے سفر کا ایک انمول تجربہ ہے......!!!

ڈاکٹر ریاض توحیدی (پنڈوارہ کشمیر)

......☆☆☆......

KAHAN GAYE YE LOG

By

NOOR SHAH
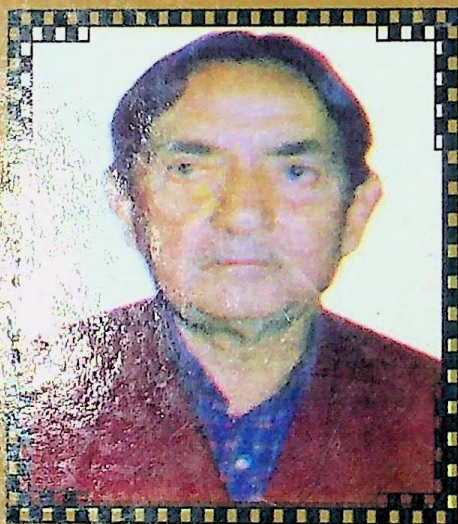
نورشاہ ایک تخلیقی فنکار ہے۔ اُن کے افسانے موضوع اور تکنیک کی ہم آہنگی کی وجہ سے
قاری کے احساس اور جذبے کو فوراً چھو لیتے ہیں اُن کی رومانیت ماحول اور فطرت کے
باطن میں اُتر جاتی ہے اور پھر کرداروں کے احساس اور جذبے تک پہنچ جاتی ہے۔
ماحول کے حسن و جمال اور کرداروں کے رویوں اور اُن کے عمل میں ایک ہم آہنگی پیدا
ہو جاتی ہے جو متاثر کرتی ہے نورشاہ کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا
ہے جیسے پہلے افسانہ نگار قاری کو لطیف اور لطیف تر رومانی ماحول اور فضا میں کھینچنے کی
کوشش کرتے ہیں پھر اُسکے بعد زندگی کی تلخ سچائیوں اور عورت اور مرد دونوں کی
نفسیات کی پیچیدگیوں کو ذہن پر نقش کرتے ہیں۔

پروفیسر شکیل الرحمن
سوتھ سٹی
گرگاؤں ہریانہ